هفت روزه

الفتح

کراچی

اشاعتِ خصوصی نومبر ۱۹۷۲ء

۲-۹ نومبر ۱۹۷۲ء



قیمت : ایک روپیہ

ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ ۲۵ پیسے



لانڈھی کے مزدوروں پر فائرنگ کے دوران شہید ہونے والے ایک مزدور کے جسم کا خون اور.......

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

اشاعتِ خاص

نومبر ۱۹۷۲ء

قیمت : —— ایک روپیہ

ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ پچیس پیسے

جلد : ۳ —— شمارہ : ۲۵

۲-۹ نومبر ۱۹۷۲ء

مدیر

وہاب صدیقی

فہرست مضامین

ارشاد راؤ پبلشر نے، حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر، دفتر ہفت روزہ الفتح - ۸۷-ڈی نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ —— سے شائع کیا

فون : —— ۴۱۲۲۷۴

حلقۂ قارئینِ "الفتح"

- آپ "الفتح" پڑھتے ہیں
- آپ کے علاقے میں کچھ اور لوگ بھی الفتح پڑھتے ہیں
- آپ آپس میں مِل کر اُن موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوں گے۔
- آپ اپنے علاقے کے مسائل پر بھی آپس میں گفتگو کرتے ہونگے، کچھ تجاویز بھی آپکے ذہن میں آتی ہونگی۔
- کیا آپ باقاعدگی سے اپنے اپنے علاقے میں مہینے میں ایک بار یا دو بار نہیں مِل سکتے۔؟ پھر ہمیں لکھیں کہ آپ نے کیا سوچا، کیا بحث کی، کیا تجاویز پیش کیں۔
- اس طرح مختلف علاقوں کے مسائل اور ان پر اپنے ہم خیال دوستوں کی سوچ بھی سامنے آئے گی۔

ہم پھر سب مل جل کر پورے ملک کے مسائل پر بھی کچھ سوچ سکیں گے اور کچھ رائے قائم کرسکیں گے۔

- ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ "الفتح" کے مرکز سے کوئی صاحب آپ کے حلقے سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں آئیں۔
- آپ کا اس تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟
- کیا ملک کی سلامتی، عوام کی بہتری، غریب و مفلس عوام کے حقوق کے حصول کیلئے "الفتح" کے قارئین اس طرح ایک ٹھوس اور فعّال کردار انجام نہیں دے سکتے؟
- اپنی سوچ سے مطلع کرنے کے لئے ہمیں لکھیے۔

انچارج حلقۂ قارئینِ "الفتح"

ہفت روزہ "الفتح"، ۸۷-ڈی، نرسری۔ کمرشیل ایریا کراچی ۲۹۔ فون: ۴۱۲۲۷۴

داخلی انتشار

ملک کی پچانوے فی صد آبادی مہنگائی اور بیروزگاری کے بھرپور حملے کی زد میں آچکی ہے۔ مزدور، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے تند و تیز وار سہہ رہا ہے۔ اس کا جسم گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی اور گرد و نواح کی دھرتی اپنے ساتھیوں کے خون سے سرخ ہو رہی ہے۔ کسان، جاگیرداروں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ چکا ہے۔ انصاف کا کوسوں تک پتہ نہیں چلتا۔ جرائم بڑھ رہے ہیں۔ قانون صرف جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سیاسی انتقام اور تحفظ کے لئے حرکت میں آتا ہے ورنہ اس کی حکمرانی کا دور دور تک نام ونشان نہیں ملتا۔ مختصر یہ کہ پانچ فیصد مراعات یافتہ متمول اور اجارہ دار طبقہ پورے زور شور اور توانائی کے ساتھ ۹۵ فی صد محروم، مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کو غلامی کے شکنجے میں جکڑنے کے عمل میں مصروف ہے۔ مہنگائی کا حشر یہ ہے۔ آٹا پچھتر پیسے سے ایک روپے سیر، چینی تین روپے اور ساڑھے تین روپے، کھانے کا تیل پانچ روپے سیر، دال دو روپے سیر، گوشت بڑا تین روپے سے ساڑھے تین روپے سیر اور گوشت چھوٹا چھ روپے سے سات آٹھ روپے سیر تک فروخت ہو رہا ہے۔

اب اندازہ لگایئے کہ ملک میں وہ کون سا طبقہ ہے جو اس مہنگائی کے بوجھ کو برداشت کر سکتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں ایک سو بیس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے یا جو زیادہ سے زیادہ دو سو روپے ماہانہ کما لیتے ہیں وہ کیسے اپنے شب و روز بسر کرتے ہوں گے۔ یہ لوگ شہروں میں رہتے ہیں، ان کا تعلق مزدوروں، کلرکوں، پولیس کے سپاہیوں، فوج اور رینجرز کے سپاہیوں وغیرہ سے ہے اور یہ اکثریت میں ہیں۔ ان کی کمائی پر آٹھ آٹھ دس دس افراد کی زندگی اور گزر اوقات کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اب آپ سوچیے اس آمدنی میں بمشکل آٹا ہی خریدا جا سکتا ہے اور باقی اشیاء کی خرید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بچوں کی تعلیم، طبی سہولتوں کا حصول اور دوسری ضروریات زندگی کی فراہمی ان کے لئے ناممکن بن کر رہ گئی ہے۔ یہ طبقہ آج بھی اس دور میں رہنے پر مجبور ہے جن میں اسکول، ادویات اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں نہ تھیں۔

پچھلے دنوں سے حکومت کے انتہائی ذمہ دار افراد نے ایک نئی رٹ لگانا شروع کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ حکومت صرف مزدوروں کی نہیں بلکہ دوسرے طبقات کی بھی ہے۔ مزدوروں کی دو تین فی صد تعداد کے مقابلے میں پورے ملک کے نظام کو افراتفری کا شکار نہیں ہونے دیا جائے گا۔ یہ بات وہ لوگ کہہ رہے ہیں جنہوں نے حصول اقتدار کے لئے مزدور کسان راج کا نعرہ بلند کیا تھا۔ بہرحال انہوں نے یہ نعرہ بلند نہ بھی کیا ہوتا تب بھی یہ حقیقت نہیں کہ یہ

ملک صرف دو یا تین فی صد مزدوروں پر مشتمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تین چار سو چھوٹے بڑے سرمایہ داروں کے مقابلے میں تین چار لاکھ مزدور ہیں۔ یہ درست ہے کہ دولت پر قابض سرمایہ دار ہیں لیکن پیداوار کی تمام ذمہ داری مزدوروں پر عائد ہوتی ہے۔ سرمایہ محنت کے بغیر مٹی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا مزدوروں کے مقابلے میں سرمایہ داروں کو تحفظ دینے کے لئے غلط اعداد و شمار پیش کرنے والے روشنی کی بجائے اندھیروں کی جانب لوٹ رہے ہیں

پاکستان مزدوروں اور کسانوں کا دیس ہے۔ ان کی اکثریت ہے۔ وہ آبادی کا پچانوے فی صد ہیں۔ مزدور کسان کا بیٹا ہے۔ یہ صرف ملوں میں کام کرنے والا ہی نہیں بلکہ شہری زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے۔ اس کے بھائی وہ بھی ہیں جو اس نظام کے تحت ان پر گولیاں چلاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مل میں کام کرنے والے مزدور اور پولیس، رینجرز اور فوج کے سپاہی کے مسائل مختلف نہیں۔ ان سب کا تعلق دیہات سے ہے۔ یہ کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کے بچے ہیں۔ ان کو کسانوں سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا اور نہ ہی ایک دوسرے کو جدا کیا جا سکتا۔ لہٰذا لانڈھی میں چلنے والی گولی سے شہید ہونے والے مزدور پر کراچی ہی نہیں تڑپے گا بلکہ پنجاب کا وہ گاؤں بھی لرز اُٹھے گا جسے یہ مزدور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

یہ غلط ہے کہ افراتفری اور انتشار پھیلانے کا ذمہ دار دو تین فی صد مزدور ہے بلکہ پانچ فی صد اجارہ دار سرمایہ دار اور جاگیردار کے لئے پچانوے فی صد آبادی کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور انہیں مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے دبانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اقتصادی زبوں حالی کے بارے میں یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ موجودہ حکومت کو برسرِ اقتدار آئے ایک سال بھی نہیں ہوا۔ ان کے پاس الہ دین کا چراغ تھوڑی ہے جو راتوں رات خوشحالی کا دور دورہ ہو جاتے۔ یہ دلیل اس وقت قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ جب عمل کے ذریعے یہ ثابت کیا جاتے کہ حکومت عوام کے مفادات پر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات کو ترجیح نہیں دے گی۔ صورتِ حال اس کے برعکس ہے اور نوکر شاہی نے اسے مزید بدتر بنا دیا ہے۔

سرکاری اداروں میں افسر شاہی نے عام آدمی کا جینا دو بھر کر دیا ہے۔ پنجاب کے ایک شخص شفیع نے ایک سال پہلے حکام سے درخواست کی کہ اس کی بیٹی زہرہ کو اغوا کرکے فروخت یا قتل کر دیا گیا ہے۔ درخواست گزار نے ملزمان کی نشان دہی بھی کی لیکن اسے انصاف کی بجائے ہر بار دھکے مار کر بھگا دیا گیا۔ اس قسم کی سینکڑوں اور ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

رشوت کا یہ عالم ہے کہ سرکاری دفاتر کے در و دیوار رشوت رشوت کی صداؤں سے گونج رہے ہیں۔ کھلم کھلا کاروبار ہو رہا ہے۔ انہیں تقویت وہ وزراء پہنچا رہے ہیں جو لوٹ مار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ اسمگلنگ کی روک تھام کی بجائے اس کی ترقی کے منصوبے بنا کر پایۂ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں۔ انصاف مہنگا، روٹی کپڑا مہنگا، پناہ نام کی کوئی شے نہیں۔ افراتفری اور لاقانونیت دعوتِ فکر دے رہے ہیں۔ لوگ سوچ رہے ہیں کہ صدر بھٹو ان باتوں سے باخبر ہوتے ہُوتے بھی کیوں خاموش ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ انہیں عوام سے دور کیا جا رہا ہے۔ عوام کٹ رہے ہیں اور وہ کیوں تماشائی بنے ہوتے ہیں۔



اکتوبر کے
احوالِ واقعی

- استعفےٰ، بنگلہ دیش، آئینی سمجھوتہ، غیر ملکی ہاتھ، کنٹرول لائن
- معظم علی کو معراج کے خلاف لکھنے کا معاوضہ مل گیا

نیپ — دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے گی

: واقعیٔ حال :

اکتوبر کا مہینہ پاکستان میں تبدیلیوں کے لئے معروف رہا ہے۔

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی شہادت، ۱۹۵۸ء میں پہلے مارشل لاء کا نفاذ، اور اس قسم کے کئی واقعات اس مہینے میں ہوئے۔ گزشتہ برس ان دنوں میں مشرقی پاکستان میں حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ مغربی پاکستان میں بھی سیاسی محاذ آرائی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور فوجی جنتا اپنے اقتدار کو طوالت دینے کے لئے آخری انگڑائیاں لے رہی تھی۔

اس سال بھی اکتوبر کا مہینہ خاصی اہم خبریں دے گیا۔ میاں محمود علی قصوری، اور معراج محمد خان کے استعفےٰ اور ان کی منظوری۔ حکمراں پارٹی کی تنظیم کے اہم واقعات ہیں۔ آئینی فارمولے پر پارلیمانی لیڈروں کی مفاہمت ۔ صدر بھٹو کی طرف سے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لئے مہم چلانے کا واضح اعلان، کنٹرول لائن پر بھارت اور پاکستان کے درمیان عدمِ اتفاق، دو پاکستانی صحافیوں کی بنگلہ دیش یاترا۔

ان تمام واقعات کا الگ الگ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

قصوری اور معراج کے استعفےٰ

میاں محمود علی قصوری نے پہلی بار استعفےٰ دیا تو صدر نے منظور نہ کرنے کا اعلان کیا۔ قصوری صاحب نے بھی صلح کا سفید پرچم لہرایا۔ لیکن بھٹو صاحب کے جانشین اور گورنر پنجاب نے ایک زوردار بیان داغ دیا کہ سب وزراء اور سب ارکانِ اسمبلی۔ کی سیٹیں جناب بھٹو کے دم قدم سے ہیں ۔ یہ لوگ بی۔ ڈی کے ممبر بھی نہیں بن سکتے تھے۔ اس بیان پر قصوری صاحب نے بڑا سخت ردِّ عمل ظاہر کیا۔ اور ساتھ ہی پھر استعفےٰ دے دیا۔ قصوری صاحب جان گئے تھے کہ اس بیان کے پیچھے کون ہے۔ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ عافیت اسی میں جانی اور استعفےٰ دے دیا ۔ ان کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ان کا استعفےٰ منظور کر لیا گیا۔ ان کے استعفےٰ سے کوئی قیامت نہ ٹوٹی۔ کیونکہ قصوری صاحب نے بھی اقتدار میں آنے کے بعد عوام سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا۔ عوام نہیں جانتے تھے کہ وہ کن نظریات کو فروغ دے رہے ہیں۔ اور اگر ان کے اختلافات بھٹو صاحب سے ہیں، تو کس وجہ سے۔

معراج محمد خان کا استعفےٰ مزدوروں اور کارکنوں کے لئے غیر متوقع نہ تھا۔ اگرچہ تاخیر سے تھا۔ وہ اس کا —— مزدوروں پر گزشتہ فائرنگ کے دنوں میں انتظار کر رہے تھے۔ پھر بھی غنیمت یہ ہے کہ معراج محمد خان کار پر جھنڈا لگنے کے باوجود خالص وزیر نہیں بنے تھے۔ یہاں وہ اب بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ جہاں سے انھیں پولیس ہمیشہ طالب علمی، اور سیاسی لیڈری کے دوران گرفتار کرتی رہی۔ راولپنڈی میں وہ اپنے بہنوئی کے گھر رہتے رہے۔ اور شروع شروع میں وہیں اپنا دفتر بھی بنایا تھا۔ انہوں نے تین ہزار روپے تک کے کرائے کی اجازت کے باوجود کوئی ایر کنڈیشنڈ بنگلہ نہیں لیا تھا۔ ان کی کوئی عادت خراب نہیں ہوئی تھی۔ بیچارے پاکستان پریس انٹرنیشنل (پی پی آئی) والے کیا جانیں۔ انہیں تو اپنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی سروس بحال کروانی تھی۔ جو لسانی ہنگاموں کے دوران بند کر دی گئی تھی

انہوں نے معراج محمد خان کے "بارئیش میکار تھی" والے بیان کے جواب میں اپنے ہفت روزہ "پیمان" میں اداریہ لکھ کر "بارئیش میکار تھی" کو خوش کرنے کی کوشش کی، کیونکہ ریڈیو، ٹی وی کی سروس کی بحالی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر جب معراج محمد خان نے استعفیٰ دے دیا اور استعفےٰ منظور ہو گیا تو ان کے مکتوب اسلام آباد میں اس استعفیٰ کی وجہ یہ بتائی گئی کہ انہیں وزارتِ اطلاعات سے قرضہ نہیں ملا تھا۔ اور یہ بھی کہا کہ ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ اور کار میں انہیں مزدور کارکن کیوں نہ یاد آئے۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ، دفتر اور کار نہ جانے کہاں تھے۔ اور کیا تھے۔ بہرحال اس محنت کا صلہ پی پی آئی کو مل گیا۔ بادشاہ را خوش آمد۔ دسروس ریڈیو ٹی وی بحال کرد۔ لسانی فسادات کی آگ بھڑکانے پر سروس بند ہوئی تھی۔ اور اپنے ہی ایک رفیق کار اور اپنی ہی پارٹی کے رہنما۔ کے خلاف مضامین شائع کرنے پر سروس بحال ہو گئی ہے۔

یہی بعض بڑے اخبارات کے سلسلے میں بھی ہوا۔ لسانی فسادات کی آگ بھڑکانے لوگوں کے جذبات مشتعل کرنے کے الزام میں جس اخبار کے اشتہارات اور کوٹہ بند کیا گیا تھا، مزدوروں کی خبریں دبانے کے معاوضہ میں اس اخبار کے اشتہارات اور کوٹہ بحال کر دیا گیا۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا اتحاد زندہ باد۔

یہ تو خیر مفاد پرست عناصر کا اتحاد تھا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ معراج محمد خان جن سے مزدوروں، دانشوروں، کسانوں اور طالب علموں نے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ لے کر مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور دانشوروں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر لا کر کسی مثبت تعمیری سمت میں لے جاتے ہیں، یا بورژوا اپوزیشن کے طور طریقے اختیار کر کے اپنی اور مزدوروں کسانوں، طالب علموں اور دانشوروں کی قوت کو بے کار صرف کر دیتے ہیں، کیونکہ مسئلہ اب صرف شخصیت کے بدلنے سے حل نہیں ہو سکتا۔ چہرہ بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا، نظام بدلنے سے بات بن سکتی۔

ڈاکٹر مبشر حسن کی واپسی

ڈاکٹر مبشر حسن کے بارے میں سنا جا رہا تھا کہ وہ بھی ناراض ہو کر چلے گئے ہیں ایک ڈیڑھ ماہ تک شدید علالت میں پڑے رہنے کے بعد انہوں نے اخبار نویسوں سے تخاطب شروع کر دیا۔ اور یہ اعلان کر دیا کہ ملکی معیشت بالکل مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس ۷ ارب روپے کا زرِ مبادلہ موجود ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک دم پاکستان کی معیشت کیسے مستحکم ہو گئی۔ اور ۷ ارب روپے کا زرِ مبادلہ کہاں سے آ گیا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب تو ریڑھ کی ہڈی کے درد کے باعث بستر پر پڑے رہے۔ اگر ان کی بیوروکریٹک مشینری اچھا کام کرتی ہے۔ تو کیا ان کی عدم موجودگی ہمیشہ بہتر نہیں ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب تو حقیقت بیانی کے لئے مشہور تھے، انہیں "سب ٹھیک ہے" کا نعرہ بلند کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ جس ملک میں صنعتی پیداوار نہ ہو۔ تالہ بندیاں ہڑتالیں مسلسل چل رہی ہوں، وہاں کی معیشت کیسے مضبوط ہو جائے گی۔ اور ۷ ارب روپے کا زرِ مبادلہ کہاں سے آ جائے گا ——— ؟

غیر ملکی ہاتھوں کا مسئلہ

مزدوروں کی تحریک کے بارے میں مرکزی وزیر محنت، سندھ کے وزیر اعلیٰ، سندھ کے وزیر محنت، اور صدر بھٹو سب کا کہنا یہ ہے کہ اس میں خفیہ ہاتھ اور وہ بھی غیر ملکی ہاتھ کار فرما ہے۔ ایک اور مرکزی وزیر نے ایڈیٹروں، دانشوروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں سے ایک نجی گفتگو میں کہا کہ کراچی میں غیر ملکی عناصر بہت سرگرم ہیں۔ ہم آپ لوگوں سے درخواست کر سکتے ہیں کہ ان عناصر کے اثر و رسوخ میں نہ آئیں۔ ایسے بہت سے سفارتی افراد ہیں، جنہیں اپنے عہدے اور سینیارٹی کے لحاظ سے اسلام آباد میں ہونا چاہیئے۔ مگر وہ کراچی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے کئی لکھنے والوں سے اچھے تعلقات ہیں۔

غیر ملکی عناصر کی نشاندہی کرنے والے یہ تمام افراد ماشاء اللہ ملک کے سب سے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ اپنے سرکاری ذرائع سے یہ ان عناصر کے خلاف کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کو روک بھی سکتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ کھل کر بات نہیں کرتے۔ آخر ایسا کیا دباؤ ہے۔

سرگرم غیر ملکی عناصر ——— جن غیر ملکی طاقتوں کے ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی گنی چنی ہیں۔ امریکہ، روس، چین اور برطانیہ۔ امریکہ سے ہم امداد لے رہے ہیں۔ اور خود امریکی لاتن پر جا رہے ہیں۔ ان سے کیا خوف ——— روس کے عناصر واقعتہً سرگرم ہیں۔ مگر جن اخبار نویسوں کے ان سے خاص تعلقات ہیں ان کو تو حکومت خود اپنے اعتماد میں لے کر ہندوستان اور بنگلہ دیش بھیجتی ہے۔ صدر صاحب اپنے

ڈاکٹر مبشر نے ، ارب روپے کے
زرِ مبادلہ کی واپسی کا اعلان کر دیا



ساتھ روس اور بھارت لے کر جاتے ہیں۔ ان سے بار بار ملتے ہیں۔ ان کے اخبارات ہر مسئلے پر روسی اندازِ فکر کی تشہیر کرتے ہیں۔ اور اپنے قارئین کو قائل کرتے ہیں۔ کہ روس کا نقطۂ نظر ہمارے حق میں ہے۔ حکومت انہیں اپنے اعتماد میں رکھتی ہے، تو دوسرے لوگ تو سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، کہ روسی نقطۂ نظر ——— ہماری حکومت کا بھی پسندیدہ نقطۂ نظر ہے ——— برطانیہ کی آج کل کوئی لائن نہیں ہے۔ وہ امریکہ کا پیرو ہے۔ لے دے کے چین رہ جاتا ہے۔ چین والے ہمارے عظیم ترین دوست ہونے کے باوجود کبھی سرگرم نہیں ہوئے۔ ان کے سفارتی افسر کبھی اخبارات کے دفتروں کے ایسے چکر نہیں لگاتے جس طرح دوسرے سفارتخانوں کے افراد جاتے ہیں ——— وہ کبھی اپنے سفارتخانے میں اخبار نویسوں کو گروپوں میں شراب پلانے کے لئے نہیں بلاتے۔ اور اگر اشارہ اس طرف ہے کہ چین یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ تو انتہائی شرم کی بات ہے۔ اگر ہم چین سے تعلقات نہیں رکھنا چاہتے، یا ان میں کمی کرنا چاہتے ہیں تو ایسے بھی کر

آج کل روس نواز عناصر
جناح روڈ کوئٹہ کی رونق بڑھا رہے ہیں

سکتے ہیں۔ ان پر اس طرح کا الزام لگانا تو کسی طور درست نہیں ہے۔ اگر حکومت کے پاس اس کے واضح ثبوت ہیں تو ان سفارتی افراد کو ناپسندیدہ قرار دے کر پاکستان سے بھیج دیا جائے۔

حکومت کو اچھی طرح علم ہے کہ روسی سفارتخانے کے افراد بہت زیادہ سرگرم ہیں۔ ان کے پیسوں سے بلوچستان میں کئی ہفت روزے اور روزنامے نکل رہے ہیں۔ بلاشبہ ان کی اپنی مزدور تنظیمیں بھی ہیں ——— روسی کرنسی جس طرح بازار میں پہنچی ہے۔ ان کا لٹریچر جس طرح تقسیم ہو رہا ہے۔ اس کے خلاف حکومت کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے۔ اس سے حکومت کی بے بسی بھی ظاہر ہے۔

آثار و قرائن بتاتے ہیں ——— کہ حکومت چین کی دوستی کی شدت کم کرنا چاہتی ہے کیونکہ پاک چین دوستی کے نعرے سے سوشلزم آنے کا خطرہ بھی رہے گا۔ مزدور کسان کی بالادستی بھی رہے گی۔ عظیم رہنما ماؤزے تنگ کے خیالات حاوی رہیں گے۔ اس لئے حکومت بالواسطہ طور پر چین کے خلاف بددلی پھیلانا چاہتی ہے۔ بنگلہ دیش تسلیم کرنے کا فیصلہ صدر بھٹو کر چکے ہیں۔ اس میں چین کی طرف سے رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے پاکستانی عوام میں رفتہ رفتہ چین کا عشق کم کرنا ضروری ہے۔

آئینی سمجھوتہ

آئینی فارمولے پر اتفاق بھی اکتوبر کا ایک اہم واقعہ ہے۔ صدر بھٹو کی طرف سے پارلیمانی نظام کو تسلیم کر لینا اور وزیر اعظم بننے کے لئے حامی بھر لینا جتنا تعجب خیز ہے، اتنا ہی نورانی، غفور اور شوکت حیات کی طرف سے پانچویں صوبے کی گنجائش نہ رکھنا بھی معنی خیز ہے۔ سب اپوزیشن لیڈر "کچھ لو۔ اور کچھ دو" کے اصول کا اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ ہم نے اس پر عمل کرتے ہوئے بہت سی باتیں تسلیم کی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صدر بھٹو نے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے مخالفین سے اس کے جواز پر دستخط کروا لیے ہیں۔ اب وہ لاکھ تاویلیں کرتے پھریں۔ صدر بھٹو نے یہ تاریخی اقدام کیا ہے ——— اور اس لئے اس کے فوراً بعد انہوں نے پنجاب کے عین قلب میں بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لئے پنجابیوں کو قائل کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اور تالاب میں کنکر پھینک کر دیکھا ہے کہ کتنا بڑا دائرہ بنتا ہے۔

آئینی فارمولا بہرحال اس لحاظ سے ایک صحیح قدم ہے کہ اس سے مرکز اور صوبوں کے اختیارات طے ہو گئے ہیں لیکن یہ حرفِ آخر نہیں ہے کیونکہ بھارت کی طرح ——— ہماری اپوزیشن اور بالخصوص نیپ دستخط شدہ معاہدوں سے پھرنے کی عادی ہے۔ اس لیے اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ ولی خان پاکستان میں واپس آکر (جو کابل تک پہنچ گئے ہیں) حالات دیکھ کر پھر زیادہ صوبائی خود مختاری کا نعرہ بلند کر دیں۔ اب لڑائی ولی خان اور بزنجو کے درمیان ہو گی۔ بزنجو ——— بھی صدر بننے کے خواہشمند ہیں اور ولی خان بھی! نیپ کا ایک گروپ اسی آئینی سمجھوتے کے خلاف بیانات دے رہا ہے جس کی قیادت خیر بخش مری کر رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیپ آئینی فارمولے کے معاہدے سے بہت جلد پھر جائے گی۔

عطاء اللہ مینگل کے خلاف کارروائی کیوں نہیں؟

بلوچستان کے وزیر اعلیٰ جناب عطاء اللہ مینگل واحد وزیرِ اعلیٰ ہیں جنہوں نے آج تک کسی گورنر کانفرنس میں شرکت نہیں کی ہے ——— کبھی علالت کا بہانہ اور کبھی کچھ! باقی تینوں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اپنے گورنروں سمیت کانفرنس میں شرکت کرتے ہیں مگر مینگل صاحب تشریف ہی نہیں لاتے۔ صدر نے انہیں شملہ جانے کی دعوت دی انہوں نے انکار کر دیا۔ بلوچستان سے مرکز کا رابطہ بالکل ختم ہے۔ گورنر بزنجو بظاہر صدر بھٹو کے اعتماد میں ہیں لیکن مینگل صاحب پر انہیں بھی کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ جس قسم کے بیانات دے رہے ہیں اس سے ایک انتہائی انفرادیت پسند اور اپنے خول میں مقید انسان کا تصوّر ابھرتا ہے ——— ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کا۔

روس اور امریکہ سے دوستی تو پھر غیر ملکی ہاتھ کس کا ہے؟

پنجاب کے خلاف ان کی شعلہ بیانی ابھی تک قائم ہے۔ حالانکہ وہ تمام پنجابی افسروں کو نکال چکے ہیں اور ان کی جگہ اپنی کابینہ کے ارکان کے "سالوں" کو نوکریاں دے چکے ہیں۔ ان کے دورِ وزارت میں شروع ہونے والے تمام اخبارات پنجاب کے خلاف زہر پھیلا رہے ہیں۔ صدر بھٹو کو انتہائی لچر زبان میں یاد کرتے ہیں۔ چین کو برِصغیر میں تمام کشیدگی —— اور گڑبڑ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، چین کی دوستی کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں۔ یہ لوگ بلوچستان کے رہنے والے بلوچی نہیں ہیں بلکہ کراچی سے تعلق رکھنے والے ہیں اور ایسے مہاجر ہیں، جنہیں نہ اردو نہ انوں نے پناہ دی جو روسی سفارت خانے میں کام کرتے رہے، اپنے آپ کو بائیں بازو کا انقلابی قرار دیتے رہے۔ جب ان کی انقلابیت کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی تو انہوں نے بلوچستان میں پناہ لی۔ جتنے راندۂ درگاہ سوشلسٹ ہیں سب بلوچستان جا پہنچے ہیں۔ اور جناح روڈ کوئٹہ ان سے معمور رہتی ہے۔ وہ روسی انقلاب کے گن گاتے ہیں۔ پنجاب کو انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہیں، چین کے خلاف علی الاعلان نفرت پھیلاتے ہیں، بھارت کی جمہوریت نوازی کے قصیدے پڑھتے ہیں —— اور اندرا گاندھی کو امن اور انسان دوستی کا علمبردار قرار دیتے ہیں —— یہ سب بلوچستان کی سرکاری رہائش گاہوں میں مقیم ہیں، کچھ وزیرِ اعلیٰ کے گھر میں رہتے ہیں، کچھ گورنر صاحب کے اور کچھ دوسرے وزراء کے گھروں میں ——!

مرکزی حکومت یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ اس کے پاس قوانین اور اختیارات بھی ہیں مگر وہ جانے کس وقت کے انتظار میں ہے۔ مینگل صاحب نے آج تک کسی گورنرز کانفرنس میں شرکت نہیں کی، ان سے کوئی جواب کیوں نہیں طلب کیا گیا؟ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ نے ایک خط کے ذریعے یہ بات ریکارڈ پر لائی تھی۔ کہ "مینگل صاحب جب بھی کراچی آتے ہیں وہ کبھی اپنے آنے اور جانے کی اطلاع نہیں دیتے۔ اس لیے سندھ حکومت ان کے لیے کوئی حفاظت کا انتظام کر پاتی ہے اور نہ ٹرانسپورٹ کا! یہ انتہائی افسوسناک بات ہے۔" مینگل صاحب نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

کنٹرول لائن کا مسئلہ

بھارت بار بار کشمیر کی کنٹرول لائن کے تعین پر گڑبڑ کر رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے فوجوں کی واپسی کا مسئلہ بھی کھٹائی میں پڑ رہا ہے۔ باخبر حلقوں کا خیال ہے کہ یہ معاملہ امریکی صدارتی انتخابات تک شاید التواء میں پڑتا رہے —— اب دیکھئے کیا ہوتا ہے ——؟

پیپلز پارٹی
کی حکومت
کس طرف
جا رہی ہے؟

گرما گرم تقریروں، خوشنما وعدوں اور نعروں کا طلسم ٹوٹ رہا ہے



لیاری کی بڑھیا پوچھتی ہے :-

- "بھٹو کہاں ہے، سوشلزم کہاں ہے"؟
- خارجہ پالیسی کی بنیاد اندیشوں اور مصلحتوں پر قائم ہے
- اب امریکہ پاکستان کا دوست بن گیا

احفاظ الرحمٰن

"تیرا بھٹو کہاں ہے ؟"
"تیرا سوشلزم کہاں ہے ؟"
"روٹی، کپڑا، مکان کہاں ہے؟"

لیاری کی ایک بڑھیا اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے ایک سوراخ سے سر باہر نکال کر پوچھتی ہے۔ جب بھٹو لیاری میں آیا تھا تو یہ بڑھیا جس کے چہرے پر برسوں کی محرومیوں کا اندھیرا پھیلا ہوا ہے، لاٹھی کے سہارے باہر گلی میں نکل آئی تھی اور محلے کے ننگ دھڑنگ بچوں کے ساتھ مل کر نعرہ لگانے لگی تھی ——— "وہ روٹی کھائیں گے، سوشلزم لائیں گے!" اس نے سوچا تھا ——— "میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے کھڑی ہوں، میری آنکھیں برسوں سے جس روشنی کا انتظار کر رہی ہیں، شاید وہ ان بے کس بچوں کے چہروں پر بکھر جائے!" اور پھر اس کی آواز پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو گئی تھی ——— "جیوے بھٹو، سدا جیوے!"

اور آج یہ بڑھیا اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے سوراخ سے سر باہر نکال کر سرِ راہ گیر سے یہ سوال کرتی ہے ——— "تیرا بھٹو کہاں ہے؟ تیرا سوشلزم کہاں

بھٹو صاحب نے

پرنس سہانوک سے

کیا وعدہ کیا تھا؟

ہے؟ روٹی، کپڑا، مکان کہاں ہے؟"

یہ لیاری کی اس بڑھیا کا سوال نہیں ہے، آج پاکستان کے چھ کروڑ بدحال انسان جن کی آنکھوں میں بھٹو کے نعروں نے زندگی کی لگن پیدا کی تھی، بیک آواز اس سوال کا جواب طلب کر رہے ہیں ——— "روٹی، کپڑا، مکان کہاں ہے؟"

انہوں نے اپنے خوابوں میں آرزوؤں کے جو خوبصورت محل بنائے تھے، ان کے ستون دھڑا دھڑ زمیں بوس ہو رہے ہیں اور انہیں شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ وہ سراب کے پیچھے بھاگے تھے اور ان کے ہونٹ اب تک پیاس سے جل رہے ہیں۔

وہ بھٹو کہاں ہے جس نے ایوبی آمریت کے قلعے کو اپنے گرز کی ایک ہی ضرب سے مسمار کر دیا تھا، وہ نڈر بھٹو کہاں ہے جس کا نام سن کر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، وہ پیپلز پارٹی کہاں ہے جس کے منشور میں صدیوں کے کچلے ہوئے انسانوں نے اپنی آرزوؤں کا عکس دیکھا تھا۔

جاگیرداروں کا سوشلزم سرمایہ داری سے مختلف نہیں ہے۔ لیاری کی اس بڑھیا کو اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ چور بازاری اور رشوت خوری کی دکانیں اب تک سجی ہوئی ہیں۔ بھوک اور مہنگائی کے عفریت اب بھی غریبوں کی جھونپڑیوں پر اپنا منحوس سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ اس کے پاس دو آنکھیں ہیں۔ یہ آنکھیں سالہا سال سے دھوپ اور چھاؤں کا کھیل دیکھ رہی ہیں۔ اور یہ ناٹک آج بھی اس کے سامنے رچایا جا رہا ہے۔ وہی جاگیردار، وہی سرمایہ دار، وہی بدعنوان سیاست دان اور وہی افسر بانواز حکام جو کل تک اقتدار پر قابض تھے، آج بھی اس کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ کچھ مہرے بدل گئے ہیں، کچھ چہرے بدل گئے ہیں لیکن شطرنج بھی وہی ہے اور چالیں بھی وہی ہیں۔

پیپلز پارٹی کا ایک دور ختم ہو چکا ہے۔ یہ اس کا روشن دور تھا، جب اس نے مجبور و مقہور عوام کی آرزوؤں کو ایک عملی تحریک کی شکل میں ڈھالا تھا اور ان سے قوت حاصل کر کے آمریت کے سب سے بڑے دیوتا کا مقابلہ کیا تھا اور رجعت پسند قوتوں کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ عوام نے اسے قوت دی تھی۔ کیونکہ اس نے عوام کو ایسے نعرے دیئے تھے جن کا وہ جنم جنم سے انتظار کر رہے تھے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خون چوسنے والے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کر کے ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالے گی، جس کے تحت تمام انسانوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا استحصال نہیں کر سکے گا!

لیکن جب سے پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے، اس کا منفی کردار زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا جا رہا ہے ——— وہ جاگیردار اور سرمایہ دار جو پیپلز پارٹی کے پچھلے دروازے سے گھس کر سرگرم کارکنوں کو کہنیوں سے دھکا دیتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ گئے تھے۔ انہوں نے تمام کرسیاں اپنے قبضے میں کر لیں اور وہ نوجوان، وہ سر پھرے کارکن جنہوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بھٹو اور اس کی پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کرایا تھا، پس منظر میں چلے گئے۔

جب سے جاگیرداروں کی یہ پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے اسی وقت سے اس کا اصلی کردار بے نقاب ہونے لگا ہے اور نیچے کے لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اوپر والوں نے سب کچھ اپنی جھولیوں میں بھر لیا ہے۔ جاگیر، جاگیردار کا ساتھ دے رہا ہے، اپنی طبقاتی برادری کے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے اور غریب کسان آج پھر مسائل کے جنگل میں اکیلا کھڑا ہے۔ اس کے راہبر اسے بھول بھلیوں میں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کر چکے ہیں۔ عوام کے وہ تمام حلقے جنہوں نے بھٹو کے ہاتھ مضبوط کیے تھے، حقائق نے آج انہیں اس نہج پر سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انہوں نے اس بھٹو کو بھی دیکھا ہے جس نے ملک بھر کی رجعت پسند قوتوں کو للکارا تھا اور انہوں نے اس بھٹو کو بھی دیکھ لیا جس نے پہلے تو سرمایہ داروں کو ڈرایا دھمکایا، ان سے زرِ مبادلہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور ان کے پاسپورٹ بھی ضبط کر لیے اور پھر چند دنوں کے بعد ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور ان سے دوستی کے پیمان باندھنے لگا۔

بھٹو صاحب نے آمریت کے خلاف عوامی تحریک کے دوران جو بلند بانگ دعوے کیے تھے، ان کی تکمیل کا وقت کب آئے گا؟ ان کی حکومت جن خطوط پر کام کر رہی ہے، ان کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان وعدوں کی تکمیل کبھی نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ طبقے جنہیں کل تک پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے مطعون کیا جاتا تھا، آج پیپلز پارٹی کی پالیسیوں کا رخ متعین کر رہے ہیں۔

جاگیردار، جاگیرداروں کا ساتھ دے رہا ہے۔

بھٹو صاحب صدر بننے سے قبل امریکی سامراج کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ لیکن جب ان کی حکومت قائم ہوئی تو وہ خود ساختہ اور ناقابلِ فہم مجبوریوں کی آڑ میں اسی امریکی سامراج کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان کے عوامی دور میں پہلی بار سیٹو کے اجلاس میں ان کے ایک وزیر نے شرکت کی اور انہوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا کہ امریکہ پاکستان کا مخلص دوست ہے۔ اب پیپلز پارٹی کی حکومت کی نئی خارجہ پالیسی کے رجحانات واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس کا جھکاؤ امریکہ کی طرف ہے اور ایک بار پھر وائٹ ہاؤس کی حکمت عملی پاکستان کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں پر حاوی ہو رہی ہے۔

الیکشن سے قبل عوامی تحریک کے دوران پیپلز پارٹی کا جو امیج بنا تھا اس سے عام لوگوں کو یہ تاثر ملتا تھا کہ جب وہ برسرِ اقتدار آئے گی تو اپنی پالیسیوں کو مصلحتوں اور اندیشوں کی بنیاد پر استوار نہیں کرے گی۔ لیکن پہلے مرحلے میں ہی اس نے ثابت کر دیا کہ وہ فیصلہ کن اقدامات کرنے سے ہچکچاتی ہے۔ جب چھوٹے ممالک نے

حقوق طلب کرنے والے

محنت کشوں کو

بھارتی ایجنٹ بنا دیا گیا



بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو اس حکومت نے بلا تاخیر ان سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ لیکن جب ایک بڑی طاقت روس نے بھی اقدام کیا تو اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور بجائے اس کے کہ گزشتہ اصول کی بنیاد پر روس سے بھی اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے جاتے، صدر بھٹو نے بنفسِ نفیس روس کا دورہ کیا اور پاکستانی عوام پر یہ انکشاف کیا کہ وہی سوشل سامراج جس نے کھلم کھلا پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا تھا اور پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی تھی، پاکستان کا ہمنوا اور مخلص دوست ہے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت سامراج کے خلاف واضح پالیسیاں بنائے گی، دنیا بھر کی حریت پسند تحریکوں کی حمایت کرے گی۔ اور ان چھوٹے چھوٹے ممالک سے تعلقات استوار کرے گی، جو بڑے ممالک کی دھونس اور دھمکیوں کا شکار ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہماری حکومت امریکہ بہادر کی ناراضگی کے ڈر سے اب تک شمالی ویت نام کی حکومت کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ جبکہ اندرا گاندھی نے آگے بڑھ کر پالا مار لیا۔ اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس حکومت سے سفارتی تعلقات قائم کر لئے۔ برسر اقتدار آنے سے پہلے بھٹو صاحب نے پرنس سہانوک کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جب ان کی حکومت بنے گی تو وہ ان کی جلا وطن حکومت کو تسلیم کر لیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ لاؤس، فلسطین اور افریقہ کی حریت پسند تحریکوں کے بارے میں بھی اس نے سرد مہری کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اردن میں اب تک پاکستانی فوج کا عملہ موجود ہے۔ جسے اردن کا رجعت پسند بادشاہ فلسطینی حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ پاکستان میں فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم الفتح نے چندے کی صورت میں عوام سے ایک لاکھ روپیہ جمع کیا تھا۔ جسے "عوامی حکومت" کے دور میں بھی منتقل کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ خارجہ پالیسی جس کی بنیاد ڈر، جھجک، اندیشوں اور مصلحتوں پر قائم ہے۔ عوام کا (MORALE) پست کر رہی ہے۔ بعض کج فہم پیپلز پارٹی کی پالیسیوں میں ناصر، سوکارنو اور سن یات سن کی قد آور شخصیتوں کا عکس تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ان شخصیتوں نے کبھی، کسی بھی مرحلے پر سامراج سے گٹھ جوڑ نہیں کیا، جبکہ پیپلز پارٹی کی حکومت شروع ہی سے میدان چھوڑ کر کونے میں جا دبکی ہے۔

اب اندرونی پالیسیوں کی طرف آیئے ——— مزدوروں، طالب علموں، کسانوں اور دانشوروں کی ایک بہت بڑی تعداد آج بھی جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند ہے ——— حریت پسند عوام ویت نام کے جانبازوں کے حق میں، مظاہرے کرتے ہیں، تو پولیس کے درندے ان پر لاٹھیاں برساتے ہیں انہیں پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیتے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ کہ پیپلز پارٹی کے ارباب اقتدار جھٹ منہ پھاڑ کر انہیں بھارتی ایجنٹ قرار دے دیتے ہیں۔ کراچی کے مزدور اپنے جائز حقوق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں تو گولیوں سے ان کے سینے چھلنی کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب مزدور اپنے شہید ساتھیوں کا جنازہ لے کر نکلتے ہیں تو بھی انہیں سنگینوں کے زور پر روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایوب خاں کے تاریک دور میں بھی بیک وقت اتنے مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ ادھر ارباب اقتدار بار بار محب وطن مزدور لیڈروں کو غدار کہہ رہے ہیں۔ آج ان لوگوں کو بھارتی ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے۔ جو شروع سے ہی بھارتی توسیع پسندوں کی جارحانہ پالیسیوں کو بے نقاب کرتے رہے ہیں۔ اور جنہوں نے پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو اپنے کندھوں پر چڑھا کر مسندِ اقتدار تک پہنچایا تھا۔ جن مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور دانشوروں نے سڑکوں پر نکل کر پیپلز پارٹی کے ترنگے جھنڈے کو ملک کے کونے کونے میں لہرایا تھا آج انھیں کوثر نیازی، حنیف رامے اور مصطفےٰ کھر جیسے رجعت پسندوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر باہر کیا جا رہا ہے۔

پیپلز پارٹی کے تمام رجعت پسند گروہوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ اور اب وہ ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے پارٹی کے سرگرم اور ترقی پسند عناصر کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ملک کی سب سے رجعت پسند جماعت کے لیڈر مودودی کو بھی آگے بڑھ کر گلے لگا رہے ہیں۔ مزدور اور کسان اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرتے ہیں تو ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر محنت نہیں کرو گے تو تمہیں تمہارے حقوق نہیں ملیں گے۔ گویا وہ محنت کش جن کی زندگی جد و جہد سے عبارت ہے، کام چور ہیں۔ گویا وہ کسان جو کھیتوں سے سونا اگاتے ہیں، وہ مزدور جن کا لہو ملوں کی چمنیوں سے دھواں بن کر نکلتا ہے، اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ وہ مزدور اور کسان، وہ دانشور اور طالب علم جنہوں نے ترقی پسند نعروں کی بنیاد پر پیپلز پارٹی کو کامیاب بنایا تھا، آج کام چور، غدار، تخریب پسند اور بھارتی ایجنٹ بن گئے ——— جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے! اس سے پہلے کسی حکومت کو عوام پر اتنا بڑا الزام لگانے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔

جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ٹولے نے صدر بھٹو کے گرد چاپلوسی، اور فریب کاریوں کا جال بُن رکھا ہے۔ اور صدر بھٹو کا جاگیردارانہ مزاج فطری طور پر اس کا عادی بنتا جا رہا ہے۔ ایوب خاں کے دور میں موقع پرست سیاسی لیڈر، اور مذہبی علماء اس کو بڑے بڑے القابات سے نوازتے تھے، تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھر لیتے تھے، لیکن آج پیپلز پارٹی کے وزراء اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے خوشامد کی تسبیح گھماتے پھرتے ہیں۔ آج یہی کھوکھلے، موقعہ پرست بونے تمام سرکاری پالیسیوں پر حاوی ہیں۔ اور وہ پیپلز پارٹی کے منشور کو اپنی مرضی کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ سوشلزم کو سرمایہ داروں کے مفادات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صحت مندانہ تنقید کو برداشت نہیں کیا جاتا —

پیپلز پارٹی کے مخلص کارکنوں کو انتقام کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

مخالفت کرنے والوں پر جعلی مقدمات بنا کر رسوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حقائق کہنے والے کو سولی کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ حکومت نے عوام کی اشک شوئی کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں میں جزوی اصلاحات کے کھلونے تھما دیئے ہیں ـــــ لیبر اصلاحات زرعی اصلاحات اور تعلیمی اصلاحات! اور ان کا اتنا زبردست پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے گویا پیپلز پارٹی نے اپنے منشور میں جس انقلاب کا وعدہ کیا تھا، وہ ان اصلاحات سے مکمل ہو گیا ہے۔ ان تمام اصلاحات میں برسر اقتدار جاگیرداروں کی فطری جھجک اور خوف کی چھاپ نظر آتی ہے۔ لیبر اصلاحات کے ذریعے مزدوروں کو چند معمولی سی مراعات دے کر تمام اختیارات سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں مجتمع کر دیئے گئے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے برسر اقتدار آنے سے پہلے "زمین اس کی جو ہل چلائے" کا نعرہ لگایا تھا۔ لیکن آج جاگیرداروں کو فی کس ۱۲ ہزار یونٹ رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ جبکہ ایوب خاں کی زرعی اصلاحات میں ۳۶ ہزار یونٹ فی خاندان کی گنجائش تھی۔ موجودہ حکومت کی ان زرعی اصلاحات سے جاگیردار بہت خوش ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی اور اس نے اپنے منشور کو عملی جامہ پہنایا تو انہیں بھی کھیتوں میں ہل چلانا پڑے گا۔ لیکن آج دائیں بازو کا رجعت پسند جاگیردار نواب مظفر پھولے نہیں سماتا۔ وہ کہتا ہے۔ "میرے پاس چار پانچ ہزار ایکڑ زمین ہے، زرعی اصلاحات کے بعد مجھے زیادہ سے زیادہ ایک دو ایکڑ زمین سے محروم ہونا پڑے گا۔ تعلیمی اصلاحات کا اعلان کیا گیا تو ایک بار پھر مراعات یافتہ طبقوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بیوروکریسی کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے ان تعلیمی اداروں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ جہاں ان کے بچے لمبی لمبی کاروں میں سوار ہو کر جاتے ہیں اور جہاں انہیں مستقبل کے لئے حکمرانی کے اسرار و رموز ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔

خود پیپلز پارٹی کے اندر انتشار بڑھتا جا رہا ہے۔ برسر اقتدار ٹولہ دیدہ و دانستہ پیپلز پارٹی کو تنظیم سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ کہ اگر نچلی سطح کے کارکن مضبوط ہو گئے تو وہ انہیں من مانی کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔ دیانت دار کارکن بددل ہو کر پارٹی کی صفوں سے باہر آ رہے ہیں، کہ وہ عوام کو بے وقوف بنانے میں جاگیردار طبقے کے ساجھے دار نہیں بن سکتے۔ ہو سکتا ہے برسر اقتدار ٹولہ اپنے کارکنوں کی اشک شوئی کرنے کے لئے ان کو از سر نو منظم کرنے کی خاطر چند اقدامات کرے۔ لیکن اس کے موجودہ رجحانات کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لیبر، زرعی اور تعلیمی اصلاحات کی طرح اس بار پھر وہ اپنے کارکنوں کو رنگین غبارے دے کر بہلانے کی کوشش کرے گا اور حسب سابق تمام اختیارات اس کے پاس رہیں گے۔

صدر بھٹو کی گرما گرم تقریروں، خوش نما وعدوں اور نعروں کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ لوگ عملی صورت میں اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ نعرے اور وعدے ان کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اگر انقلاب آ گیا ہے، سوشلزم نافذ ہو گیا ہے، تو لیاری کی وہ بڑھیا ہر راہ گیر کی طرف سوالیہ نظروں سے کیوں دیکھتی رہتی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ سوشلزم کیا ہوتا ہے۔ اس نے تو سوشلزم کی حمایت اس لئے کی تھی کہ اسے روٹی، کپڑا اور مکان ملنے کی آس تھی۔ اس کی یہ آس ٹوٹ رہی ہے۔ اور اس کی بجھتی آنکھوں میں سالہا سال کی محرومیوں کے سائے اور بڑھتے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں ملک کے تمام ترقی پسند حلقوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام لوگوں کو سوشلزم کا صحیح مفہوم بتائیں، انہیں یہ بتائیں کہ سوشلزم جاگیرداروں کے فیشن کا نام نہیں ہے۔ یہ دنیا طبقات کی دنیا ہے۔ اور جاگیردار طبقہ کبھی محنت کش طبقوں کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتا۔ انقلاب راتوں رات نہیں آتا۔ اس کے لئے ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ انقلاب اس وقت آتا ہے جب مظلوم طبقے ظالم طبقوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی صفوں کو منظم کرنا چاہیئے۔ اور آپس میں متحد ہو جانا چاہیئے۔ موجودہ حکومت کے رجحانات سے واضح طور پر اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دائیں بازو کے رجعت پسندوں سے مل کر تمام ترقی پسند حلقوں کو کچلنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ دشمن شب خون مارے انھیں اپنی صفیں درست کر لینی چاہئیں۔ صبر و تحمل کے ساتھ خود کو منظم کرنے کی کوشش کریں۔ منکسر مزاجی کے ساتھ عوام کو طبقاتی تعلیم دیں۔ اور اپنے آپس کے بے بنیاد اختلافات ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اس وقت ترقی پسند عناصر

عوام کو جزوی اصلاحات سے بہلایا جا رہا ہے

مختلف گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان گروپوں کی لیڈر شپ کے کردار کے بارے میں تو کسی قسم کے شبہے کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کے عام کارکنوں کی اکثریت پوری طرح مخلص، دیانت دار اور سرگرم ہے۔ اور وہ پوری لگن کے ساتھ عوام کے اندر کام کر رہی ہے۔

ان دیانت دار اور مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر آ جانا چاہیئے۔ اور ایک دوسرے پر بلاوجہ کیچڑ اچھالنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ ورنہ اگر وہ گروہ گروہ ہوں میں بٹے رہیں گے تو ان کے طبقاتی دشمن انہیں آسانی سے ہڑپ کر جائیں گے۔ بکھری ہوئی لکڑیاں جب جمع ہو کر گٹھے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو انہیں توڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں عوام کا شعور تیزی سے آگے بڑھا ہے۔ اگر اس شعور کو صحیح رُخ پر لگا دیا جائے تو ان کی قوت سیلاب کی طرح ہر ایک رکاوٹ کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گی۔ عوام کی حمایت حاصل کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

سرشاہنواز علی بھٹو پر
سرکاری ڈیری فارم کے
۴۶۴ روپے واجب الادا ہیں

صدر بھٹو بھارت کے مقروض ہیں

———— : الفتح رپورٹ : ————

"صدر بھٹو حکومتِ گجرات (بھارت) کے چار سو چونسٹھ روپے کے مقروض ہیں"!

بڑی عجیب بات ہے، جب یہ خبر ہاتھ لگی تو یقین نہ آیا۔ ویسے تو ساری قوم امریکہ بہادر کی مقروض ہے۔ بال بال قرضہ میں بندھا ہوا ہے، مگر قوم کی بات الگ اور بھٹو صاحب کی بات الگ ہے۔ وہ صدر نہ بنتے جب بھی پشتوں کے رئیس اور جاگیردار آدمی ٹھہرے۔ ۴۶۴ روپے تو ان کے ایک ملازم کی تنخواہ بنتی ہوگی۔ گمان گزرا کہ دشمنوں نے ہمارے صدر کو بلاوجہ اخبار کی سنسنی خیز سرخی بنانے کے لیے ایک خبر گھڑلی۔ دوبارہ خبر پڑھی تو پوری تفصیل درج تھی۔ پتہ چلا کہ ہمارے صدر صاحب واقعی حکومتِ گجرات کے مقروض ہیں اور ان پر چار سو چونسٹھ روپے کی حقیر رقم واجب الادا چلی آ رہی ہے۔

اس واقعہ کی تفصیلات کلکتہ سے شائع ہونے والے انگریزی روز نامہ "ہندوستان اسٹینڈرڈ" کے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کے شمارے میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے مطابق تقسیمِ ہند سے قبل صدر بھٹو کے والد سرشاہنواز بھٹو ریاست جوناگڑھ کے دیوان تھے۔ ریاست میں یہ بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ ملازمت کے دوران ان کے یہاں سرکاری ڈیری سے دودھ آتا تھا اور ماہ بہ ماہ اس کی ادائیگی ہوتی تھی۔ اسی دوران ملک تقسیم ہوگیا اور سرشاہنواز بھٹو جن کی تمام تر ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں، پاکستان چلے آئے۔

سرشاہنواز بھٹو جب جوناگڑھ سے چلے ہوں گے تو ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی۔ کہ وہ حکومتِ گجرات (بھارت) کے مقروض ہیں اور ان پر سرکاری ڈیری کی ۴۶۴ روپے کی رقم کی ادائیگی واجب ہے۔ خاصا افراتفری کا زمانہ تھا۔ لٹی پٹی آبادیاں اِدھر سے اُدھر کوچ کر رہی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈیری والوں نے رقم کی ادائیگی کا تقاضا نہ کیا ہوگا۔ سرشاہنواز کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ریاست جوناگڑھ کے دیوان اور لاڑکانہ کی بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ چنانچہ رقم کی ادائیگی نہ ہو سکی اور سرشاہنواز بھٹو پاکستان چلے آئے۔

تقسیم کے بعد حالات درست ہوئے تو پتہ چلا کہ ریاست جوناگڑھ کے سابق دیوان اور لاڑکانہ کے سب سے بڑے رئیس سرشاہنواز بھٹو حکومتِ گجرات (بھارت) کے چار سو چونسٹھ روپے کے مقروض ہیں۔ یہ معمولی رقم بہت عرصے تک ریاست سوراشٹر کی فائلوں میں پڑی رہی بعد میں سابق ریاست بمبئی کے ریکارڈوں میں منتقل کردی گئی۔ اور اب ۱۹۶۶ء سے حکومتِ گجرات کے (بھارت) ریکارڈ میں صدر بھٹو کے والد سرشاہنواز بھٹو کے نام پر چار سو چونسٹھ روپے کی رقم چلی آ رہی ہے۔

شاید اس خبر کی بھنک بھارت کے "جن سنگھیوں" اور پاکستان کے جماعتیوں کو نہیں لگی ورنہ دونوں جگہوں میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ دلّی اور بمبئی کی سڑکوں پر جن سنگھی کارکن اور کراچی اور لاہور کی سڑکوں پر جماعتیے بڑے بڑے بینر اور کتبے اٹھائے معمولی سی رقم کی ادائیگی کو کشمیر اور نہری پانی سے زیادہ سنگین مسئلہ بنا دیتے۔ ہڑتالیں ہوتیں، توڑ پھوڑ ہوتا۔ جگہ جگہ سڑکوں پر ٹائر جلا کر آگ روشن کی جاتی اور صدر بھٹو سے مطالبہ کیا جاتا کہ یہ رقم کیوں لی گئی، کیسے لی گئی اور اگر لی گئی تو اب تک ادا کیوں نہیں کی گئی۔ پاکستانی قوم کا سر ندامت سے جھک گیا ———— اور یہ بھی مطالبہ کیا جاتا کہ جب تک بھارت ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کو واپس نہیں کرتا اس رقم کی ادائیگی نہ کی جائے۔ اُدھر "جن سنگھی" نعرہ لگاتے جب تک بھٹو صاحب قرض نہیں اتارتے پاکستان سے کسی قسم کا سیاسی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ شملہ معاہدے کو کالعدم قرار دیا جائے ... جنگی قیدیوں کو واپس نہ کیا جائے ———— وغیرہ — وغیرہ ————!

مثلاً یہی دیکھئے کہ ہر آدمی بے سرے انداز میں کہتا پھرتا ہے "قرض محبت کی قینچی ہے" ———— لوگوں کے پاس جب کچھ نہیں ہوتا تو "بے پر" کی اڑاتے ہیں ———— اگر قرض محبت کی قینچی ہوتی تو صدر بھٹو بھارت کیوں جاتے، شملہ معاہدہ کیونکر وجود میں آتا اور ۲۵ سال بعد بھارت اور پاکستان کے درمیان باہمی مسائل طے کرنے کے لیے افہام و تفہیم کا راستہ کیوں اختیار کیا جاتا؟

یہ سب چار سو چونسٹھ روپے کی رقم کے کرامات ہیں ———— جی ہاں — ! اگر یقین نہ آئے تو کسی جماعتیے کو پکڑ کر پوچھ لیں!



ابنِ انشاء



ماں بچّے کو گود میں لئے بیٹھی ہے

"ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے ——— حالانکہ یہ فرض بچّے کا تھا۔ "بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے، اے بی بی اس کے مُنہ میں چوسنی دو! ویسے انگوٹھا چوسنا بھی کچھ بری بات نہیں، ہاں لوگوں کا خون نہیں چوسنا چاہیئے جیسے لوگ بڑے ہو کر چوسنے لگتے ہیں ——— اس کو دودھ کونسا دیتی ہو؟ ... ڈبّے کا! اچھی بات ہے، دودھ ڈبے کا دیا ہے تو تعلیم اس کو انگریزی کی دینا، اپنی زبان کی مت دینا۔ اس کا مستقبل خراب مت کرنا!

ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے، پاس ڈالڈا گھی کا ڈبہ پڑا ہے۔ اس گھی والوں کا کہنا ہے کہ ——— "جہاں مامتا ہے وہاں ڈالڈا کا ہونا بھی ضروری ہے!"

جس زمانے میں ڈالڈا گھی نہیں ہوتا تھا مائیں اپنے بچوں سے محبت تھوڑا ہی کیا کرتی تھیں، اٹھا اٹھا کر پٹخا کرتی تھیں، جوتے مار کر گھر سے نکال دیا کرتی تھیں مامتا انمول چیز ہے لیکن اب تو ڈالڈا بھی انمول چیز ہے۔ سیٹھ ہر سال دام بڑھا دیتے ہیں۔ اب تو یہی نسخہ ٹھیک ہے کہ گھی کو بوتل میں بھر کر رکھو، دور ہی سے روٹی کو چھواؤ اور کھاؤ

ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے ——— تاکہ بچّے کا باپ کچھ کرنے کو دکھ دے۔ باپ بھی کچھ کم احدی نہیں، بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد کے زمانے سے پیئے جا رہا ہے! اچھا بھائی! پی لے! یہ تو سچ ہے کہ حقہ نقصان نہیں کرتا، سگریٹ نقصان کرتا ہے، ہاں! حقہ الٹ ضرور جاتا ہے ——— پچھلے دنوں کے انتخابات میں یہی کچھ ہوا۔ غریبوں اور کسانوں نے زرداروں اور زمینداروں کی چلمیں بھرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ تلواریں کھینچ کر چڑھ دوڑے تھے، لیکن "حقے" کا نشہ بھی عجیب ہے لوگ پھر سیدھا کر لیتے ہیں اور گڑگڑانے لگتے ہیں بلکہ گانے لگتے ہیں۔

ع حقّہ حکم خدا دا
حِبّ لم حُقّے دی دھی
جنھّے حُقّہ ویکھئے
اوتھّے لیے پی

ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے ——— ذرا سنو تو بچّے سے کیا باتیں کر رہی ہے "میری جان! وہ دن کب آئے گا جب تو بڑا ہو گا الیکشن میں کھڑا ہو گا، ممبر ہو کر وزیر بنے گا۔ ورنہ ٹھیکیدار ہو کر امیر بنے گا، ٹھیکے لے گا، دولت کمائے گا، کچھ آپ کھائے گا، کچھ ٹھیکے دلانے والوں کو کھلائے گا۔"

بچّہ مسکراتا ہے کہ یہ لوگ کتنے سادہ لوح ہیں، زمانے کا تقاضا نہیں جانتے ہوا کا رُخ نہیں پہچانتے! ——— "اے میرے پیارے والدین! پرانا نظام اب جاوے ہی اور نیا نظام آوے ہی آوے!"

ابنِ انشار

گدھا



گدھا بڑا مشہور جانور ہے۔ گدھے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ چار پاؤں والے، دو پاؤں والے، سینگ ان میں سے کسی کے سر پر نہیں ہوتے۔ آج کل چار پاؤں والے گدھوں کی نسل گھٹ رہی ہے۔ دو پاؤں والوں کی بڑھ رہی ہے۔ بعضے دو پاؤں والے تو اپنے کو گدھا کہلوانے میں عار بھی سمجھتے ہیں۔ ہاں ضرورت کے وقت اس کا نام اپنی ولدیت کے خانے میں لکھوانے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔

گھوڑے کی شکل ایک حد تک گدھے سے ملتی ہے۔ بعض لوگ گدھے گھوڑے کو برابر سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ دونوں کو ایک تھان پر باندھتے ہیں یا ایک لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر گدھا اس پر اعتراض کرے تو کہتے ہیں۔ سنو ذرا اس گدھے کی باتیں۔ سوچنے کی بات ہے اگر گھوڑا کسی لائق ہوتا تو حضرت عیسیٰ اس پر سواری نہ کرتے۔ گدھے کو کیوں پسند کرتے ؟ شاعروں نے بھی گدھے کی ایک خوبی کی تعریف کی ہے۔ خرِ عیسیٰ ہو یا کوئی اور گدھا اگر وہ مکہ بھی ہو آئے تو گدھا ہی رہتا ہے۔ دوسرے جانور بشمول آدمی تو اپنی اصل بھول جاتے ہیں۔ واپس آکر جانے کیا کیا کہلاتے ہیں۔ القاب کے دُم چھلے لگاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے ایک زمانے میں گدھوں کی مشابہت گھوڑوں کی بجائے آدمیوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ ہمارا مطلب ہے شکل کے اعتبار سے، کیونکہ عقل کے اعتبار سے تو اب بھی ہے۔ مرزا غالبؔ اپنے محبوب کے دروازے پر کسی کام سے گئے تھے۔ اس کا پاسبان یعنی دربان ان کو حضرت عیسیٰ کی سواری کا جانور سمجھ کر بوجہ احترام چپ رہا۔ لیکن جب انھوں نے کنوتیاں جھاڑ کر اس کے قدم لینے کی کوشش کی تو سمجھ گیا کہ یہ تو نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر ہیں۔ چنانچہ کما حقہ بدسلوکی کی ——————

سوالات

۱۔ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے ؟ اگر نہیں ہوتے تو یہاں سے بھیجے جائیں ؟ اگر ہوتے ہیں تو وہاں سے منگائے جائیں ؟ گدھوں کی طرح ہمارا منہ مت دیکھو —— جواب دو۔

جمیل الدین عالی

آخری رکاوٹ

انقلاب آئے گا
انتشار کی دیوار
آخری رکاوٹ ہے
یہ بھی ٹوٹ جائے گی

آزادی کے مقدمات

میرٹھ سازش کیس

برِصغیر کے انقلابیوں کے خلاف

برطانوی سامراج کی پہلی سازش

—: نعیم الحسن :—

برِصغیر پاک بھارت میں سامراج کے اشارے پر کمیونزم کی ڈوک تھام کے لئے بے شمار تدابیر اختیار کی گئیں۔ لیکن نئے نظریات اور انقلابی خیالات سارس لکاڈیں اپنی طوفانی لہروں میں خس وخاشاک کی طرح بہا کرلے گئے۔ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور یورپ غرضیکہ ہر جگہ نئی نسل غیر متزلزل عزم کے ساتھ انقلاب برپا کرنے کے لئے مارچ کررہی ہے۔ بھارت کے بعض علاقوں میں کمیونسٹ گروپ اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، مگر انقلابی اصولوں سے انحراف اور رجعت پسند کانگریسی حکومت کی سازشوں سے ان کے اقتدار میں پائیداری حاصل نہ ہوسکی۔ بھارتی حکومت کمیونسٹوں سے خوفزدہ ہے، اور ان کے خلاف دوسری رجعت پسند اور موقع پرست پارٹیوں سے ساز باز کرکے سازشیں تیار کرتی رہتی ہے۔

برطانوی میرٹھ سازش کیس نے پہلی بار باہر کی دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ بھارت کی قدیم تہذیبی دنیا نئے انقلابی نظریات اور خیالات کی زد میں ہے۔ ہیرالڈ لاسکی نے میرٹھ سازش کیس کو برطانوی انڈیا کی تاریخ کا ایک المناک واقعہ قرار دیا ہے۔ برطانوی حکومت نے بھارت کو روس کے اثر سے نکالنے کے لئے بھارتی کمیونسٹوں کے خلاف میرٹھ سازش کیس کا انتہائی جارحانہ اور خوفناک ڈرامہ اسٹیج کیا۔

۱۹۲۱ء میں ٹریڈ یونین کے ممتاز مزدور رہنماؤں نے بھارت میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایک شاخ قائم کی۔ شاخ کے اراکین نے اپنے آپ کو کمیونسٹ پارٹی میں ضم کردیا۔ پارٹی کے مطبوعہ دستور کے مطابق اس کی ممبر شپ ایسے لوگوں تک محدود تھی جو کمیونسٹ انٹرنیشنل کے مندرجہ ذیل پروگرام سے ذہنی اور عملی طور پر متفق تھے۔

۱۔ کمیونسٹ انقلاب کے ذریعے بورژوائی نظام کا تختہ الٹ دینا۔

۲۔ پرولتاریہ کی آمریت کا قیام۔ کمیونسٹ انقلاب کے دوران، قومی آزادی کی جنگ اور نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی جدوجہد کی مدت بھی شامل ہے۔

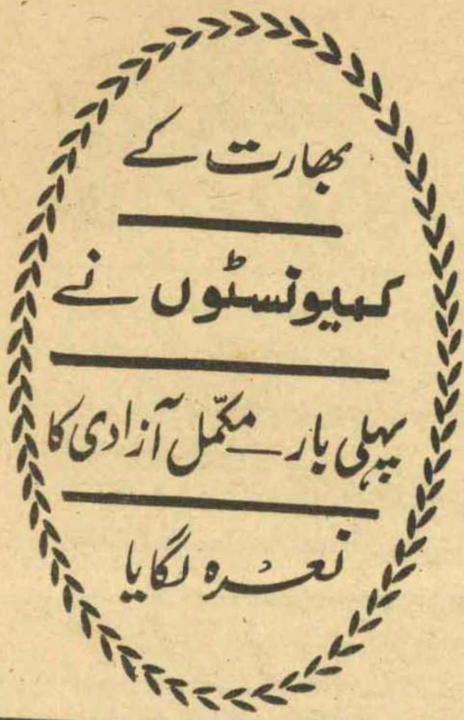
۴۔ پرولتاری آمریت قائم کرنے کے لئے بورژوا ریاست اور اس کے تمام ذرائع کو بتدریج مفلوج بنا کر تباہ وبرباد کرنا۔ اور پرولتاریہ کی قیادت میں نئی حکومت کا قیام۔ اقتدار حاصل کرنے کے لئے، محنت کشوں کی جدوجہد کا سب سے ضروری حصہ بورژوا طبقہ کی فوج اور دوسری استحصالی مشینریوں کو نیست ونابود کرنا ہے۔ جدوجہد کے دوران اس بات کو مرکزی اہمیت دینا کہ محنت کشوں کو زیادہ سے زیادہ مسلح کیا جائے اور بورژوازی کو غیر مسلح۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل نے انقلابی مقصد کے حصول کے لئے بڑے محتاط طریقے سے طریقہ کار اور حکمتِ عملی کے بارے میں اپنا پروگرام تیار کیا تھا۔ جس کا نام پرولتاریہ کی فتح تھا۔ پارٹی کے ممبروں کو تفصیلی ہدایات "انقلابی صورتِ حال اور پارٹی حکمتِ عملی" کے تحت فراہم کی گئیں۔

انڈیا کی کمیونسٹ پارٹی نے برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے عوام کو مسلح جدوجہد کی ترغیب دیتے ہوئے اسے اولیت دی۔ جبکہ کانگرس برطانوی نوآبادی سے نجات کا مبہم اور صلح کل نعرہ "سوراج" لگا رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی محنت کشوں کی قیادت میں برطانوی سامراج کے اقتدار کا تختہ الٹ کر پرولتاری آمریت قائم کرنی چاہتی تھی۔

چند سال کے دوران کمیونسٹ پارٹی کا پروگرام بھارت کے عوام بالخصوص نوجوان نسل میں مقبول ہونے لگا۔ خود کانگریس کا ایک حصہ کمیونسٹ پارٹی کے نئے انقلابی نظریات سے متاثر تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو انقلابی نظریات سے متاثر تھے مگر انھوں نے پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ اور کانگریس کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے وہ کانگریس کے وفادار رہے۔ اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ سوراج پرامن اور قانونی طریقہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہڑتال اور مسلح جدوجہد قانونی طریقۂ کار نہیں ہے۔

۱۹۲۱ء میں کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی اور ۱۹۲۸ء کے آخر میں آل انڈیا مزدور اور





کسان پارٹی قائم کی گئی۔ پنجاب کے ایک ممتاز کارکن سردار سوہن سنگھ جوش کی رہنمائی میں نئی پارٹی نے کلکتہ میں کام شروع کیا۔ انہوں نے پارٹی کے جلسہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"بھارت صحیح معنوں میں اس وقت آزاد ہو گا جب بھارت سے برطانیہ کے تمام مفادات ختم کر دیئے جائیں۔ اور ان کو بوریہ بستر لپیٹنے پر مجبور کر دیا جائے۔ کیا پنڈت نہرو کے پُرامن انقلاب کے نظریے سے برطانیہ کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ ہماری مزدوروں اور کسانوں کی پارٹی ایک آزاد پارٹی ہے۔ اور ہمارا نعرہ مکمل آزادی ہے۔ ایسے تمام لوگ جو طبقاتی جدوجہد اور انقلاب پر یقین رکھتے ہیں، انہیں اس پارٹی میں شامل ہونا چاہیئے۔ اور مزدوروں اور کسانوں کے انقلابی پروگرام کے لئے متحد و منظم ہونا چاہیئے تاکہ ایک مکمل سیاسی اور معاشی آزادی کیلئے انقلاب برپا کیا جا سکے۔

سردار سوہن سنگھ نے پارٹی کے کارکنوں کو ہدایات دیں کہ جب برطانوی سامراج جنگ میں ملوث ہو جائے تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

جوں ہی جنگ شروع ہو، ہمیں بڑے پیمانے پر ہڑتال، سبوتاژ، اسٹرائیک اور بائیکاٹ کی تحریک کے ذریعہ دشمن کو پریشان کرنا چاہیئے۔ جب دشمن جنگ میں مصروف ہو تو ہمیں ایسی حکمتِ عملی پر چلنا ہو گا جس سے دشمن دو طاقتوں کے درمیان پھنس کر رہ جائے۔ چونکہ روس کی بالشیوک پارٹی نے ہمیں یہ راستہ دکھایا ہے اس لئے کہ ہم اس کے شکر گزار ہیں۔

کُل بھارت مزدور کسان پارٹی کے صدر نے گو اس بات کا اعلان نہیں کیا کہ ان کی پارٹی، ایک کمیونسٹ تنظیم ہے۔ پھر بھی اس کے نظریات اور حکمتِ عملی سے صاف ظاہر تھا کہ یہ کمیونسٹ پارٹی سے متاثر ہے، اس بات کی تصدیق پارٹی کے مطبوعہ منشور سے بھی ہوتی ہے۔ بنگال، بمبئی اور پنجاب کے مزدوروں اور کسانوں کے خیالات کانگریس سے بالکل مختلف تھے، وہ مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے تھے اور پارٹی کے منشور کے مطابق برطانوی سامراج سے مکمل سیاسی اور معاشی آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

بھارت میں کمیونسٹ، مزدوروں اور کسانوں کی انقلابی پارٹیوں کے وجود سے بھارتی حکومت اور صوبائی انتظامیہ خبردار ہو گئی۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے کمیونسٹوں کے خلاف کارروائی شروع کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ بھارت کے انقلابی مزدوروں اور کسانوں پر ظلم و تشدد کی ابتدا میرٹھ سازش کیس سے کی گئی۔

مقدمہ سے قبل پورے ہندوستان میں کمیونسٹوں کے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائی شروع کر دی گئی۔ ملک کے متعدد علاقوں میں تیزی سے چھاپے پڑنے لگے۔ اور گرفتاریاں عام ہو گئیں حکومت نے بڑی تعداد میں کمیونسٹ لٹریچر کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ان تمام کمیونسٹ دشمن ایکشن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت انقلابیوں کو طاقت اور تشدد کے ذریعہ کچلنے کی فکر میں تھی۔ چنانچہ کمیونسٹ رہنماؤں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف بغاوت کے سنگین الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ حکومت کی جانب سے مارچ ۱۹۲۹ء لینگفورڈ جیمس نے ایک درخواست پیش کی۔ جس میں کہا گیا کہ!

۱۔ روس میں کمیونسٹ انٹرنیشنل نام کی تنظیم کا مقصد مسلح جدوجہد کے ذریعہ دنیا کی تمام حکومتوں کے اقتدار کا خاتمہ ان کی جگہ سودیت جمہوریہ قائم کرنا ہے۔

۲۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کا پروگرام ہے کہ مسلح ابھار اور اسٹرائیک کے طریقہ کار پر چلتے ہوئے، بورژوا حکومتوں کا تختہ الٹ دیا جائے، اس کے لئے ابتدائی طور پر مزدور کسان پارٹیاں یوتھ لیگ اور ٹریڈ یونین بنائی جائیں۔ اور ایسی تنظیموں میں کمیونسٹوں کو شامل کیا جائے۔ جو کارکنوں کو ذہنی اور عملی طور پر انقلاب کے لئے تیار کریں۔

۳۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل مختلف کمیونٹیز میں کام اور پروپیگنڈہ کرتا ہے۔

۴۔ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کمیونسٹ انٹرنیشنل کا ایک حصہ ہے۔

۵۔ ۱۹۲۱ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایک شاخ برطانوی ہند میں قائم کی گئی، اس کی بنیاد

کمیونسٹ پارٹی کے صدر
مظفر احمد کو عمر قید کی سزا دی گئی

ڈانگے، شوکت عثمانی اور مظفر احمد نے رکھی۔ یہ کمیونسٹ رہنما تاج برطانیہ کو بھارت کے اقتدار سے محروم کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔

۶۔ برطانیہ کمیونسٹ پارٹی کے دو ممبروں اسپراٹ اور بریڈلے کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی طرف سے بھارت بھیجا گیا۔

۷۔ انڈیا کی کمیونسٹ پارٹی کے بے شمار رہنما اور کارکن مختلف شہروں میں بادشاہ کو برطانوی ہندوستان کے اقتدار سے محروم کرنے کے لئے کام کر رہے ہیں۔

۸۔ ملزموں نے اس مقصد کے لئے میرٹھ میں مزدور کسان پارٹی بنائی ہے۔ اور اس جگہ کانفرنس کی گئی۔

شاہ برطانیہ کو برطانوی ہند کے اقتدار سے محروم کرنے کی نام نہاد سازش میں ۳۱ افراد کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے گرفتار کیا گیا۔ ان پر ۱۲۰۔بی (سازش) اور سیکشن ۱۲۱۔اے کے تحت خطرناک الزامات عائد کئے گئے کہ مذکورہ ملزم جرائم اور طاقت کے ذریعہ شاہ برطانیہ کو برطانوی ہند کے اقتدار سے محروم کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ مقدمہ میرٹھ کے ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا۔ دو افراد مسٹر ملسر وائٹ اور دھرم ویر سنگھ کو بری کر دیا گیا۔ جبکہ دو افراد ڈی ار تھینگڈی اور کیشوری لعل گھوش مقدمے کی کارروائی کے دوران انتقال کر گئے۔

پہلے گروپ کے جن ممبروں پر مقدمہ چلایا گیا ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی انڈیا سے بتایا گیا ان میں بارہ افراد مظفر احمد، ایس اے ڈانگے گھاٹے، جوگلیکر، نمبکر، ایس ایس مراجکر، عثمانی سوہن سنگھ جوش، عبدالمجید، اجودھیا پرشاد، ادھیکاری اور شمس الہدیٰ شامل تھے۔ یہ تمام لوگ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی، مزدور کسان پارٹی اور دوسری ٹریڈ یونینوں کے ممتاز رہنما اور ممبر تھے۔

دوسرے گروپ میں دو ممبروں کا تعلق برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی سے تھا اور جو ہندوستان میں پہنچ کر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی میں کام کر رہے تھے۔ ان دونوں ممبروں کا نام فلپ اسپراٹ اور بی ایف بریڈلے تھا۔ دونوں کیمبرج کے گریجویٹ تھے۔ اسپراٹ ۱۹۲۷ء میں ہندوستان آیا اور اسمبلی کے رکن دیوان چمن لعل کے گھر میں ٹھہرا۔ جبکہ بریڈلے ۱۹۲۸ء میں ہندوستان میں وارد ہوا اور آتے ہی ٹریڈ یونین تحریک میں شامل ہو گیا۔

تیسرے گروپ میں چھ افراد تھے۔ نہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں بنے تھے، مگر تحریک سے متاثر تھے، اور سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ ویلسانی، ایس ایچ جھابوالا کیدارناتھ سہگل، علوی، کسلے، گوری شنکر اور قدوا۔

مقدمہ کی کارروائی ساڑھے چار سال تک جاری رہی۔ مجسٹریٹ کی عدالت کی ابتدائی کارروائی میں سات ماہ لگ گئے۔ ۱۴ جنوری ۱۹۳۰ء میں ملزموں کو سیشن کے سپرد کیا گیا۔ سیشن کورٹ میں تقریباً تین سال تک طویل اور تکلیف کارروائی جاری رہی۔

استغاثے کے گواہوں کے بیانات تیرہ ماہ میں مکمل ہوئے، جبکہ گرفتار شدگان کے بیانات دس ماہ میں پورے ہوئے۔ صفائی کے گواہوں کے بیانات میں دو ماہ صرف ہوئے۔ دلائل میں ساڑھے چار ماہ لگے۔ تحریری فیصلے کی مدت پانچ ماہ میں پوری ہوئی۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران لاتعداد ڈاکومنٹری ثبوت، کاغذات، ٹائپ شدہ اور قلمی کاغذات، کتابیں، پمفلٹ، خطوط، نوٹس، سپیس اور دیگر شہادتیں پیش کی گئیں۔ استغاثے کی طرف سے تین ہزار پانچسو دستاویزات پیش کئے۔ جبکہ وکیل صفائی کی جانب سے ایک ہزار پانچسو دستاویز کی نقلیں عدالت کے روبرو گزاری گئیں۔ ۳۲۰ گواہوں کے بیانات قلمبند کئے گئے۔

استغاثے کی جانب سے مقدمے کی کارروائی کو طول دینے کی جان بوجھ کر کوشش کی گئی۔ تاکہ اس دوران زیادہ سے زیادہ شہادتیں پیش کر کے عدالت کو یقین دلایا جاسکے، کہ ملزمان شاہ برطانیہ کے اقتدار کے خلاف خطرناک سازش میں مصروف تھے۔ اور ان کا مقصد خون خرابہ کے ذریعہ شاہ کا تختہ الٹ کر ہندوستان میں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنا تھا۔ حکومت کارروائی کو زیادہ سے زیادہ طول دے کر کمیونسٹوں کے خلاف رائے عامہ کو گمراہ کرنا چاہتی تھی اور عوام کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ سوویت یونین کے نظام سے ہندوستان ہی کو نہیں پوری دنیا کو خطرہ لاحق ہے۔ لیکن مقدمے کی طول طویل کارروائی سے کمیونسٹوں کو زیادہ فائدہ پہنچا، انہوں نے عدالتی کارروائی کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ اور عوام کے سیاسی شعور کو پختہ کیا۔ میرٹھ سازش کیس استغاثہ اور صفائی دونوں کے لئے اول درجے کا ایک سیاسی اسٹیج ثابت ہوا۔

کمیونسٹ پارٹی کے صدر مظفر احمد نے اپنے بیان میں کہا۔

"میں ایک انقلابی کمیونسٹ ہوں اور گرفتاری کے دن تک میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر رہا۔ ہماری پارٹی، پالیسی، پمفلٹ اور پروگرام کے سلسلہ میں کمیونسٹ انٹرنیشنل سے پوری طرح متفق ہے۔ اور ان حالات میں اپنے نظریات اور اصولوں کا بہتر طریقے سے پرچار کیا۔ میں اس بات کے اظہار میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

میرٹھ کے مقدمے پر
برطانیہ کو بیس لاکھ روپے
خرچ کرنا پڑا

کہ اپنی کمزوریوں کے باوجود میں اس ملک کے کمیونسٹ تحریک کے ہراول دستے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

ڈانگے نے بھی اپنے بیان میں کمیونسٹ تحریک اور نظریات سے متعلق کسی بات کو پوشیدہ نہیں رکھا اور صاف صاف الفاظ میں بیان دیا کہ۔

"کمیونسٹ، سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں، ہندوستان کے کمیونسٹ برطانوی سامراج کے اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں۔"

دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈانگے نے کمیونسٹ تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۲۷ء میں کانپور سازش کیس سے رہائی کے بعد انہیں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پریسیڈیم کا ممبر بنایا گیا۔ انہوں نے کسان اور مزدور پارٹی میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ کرانتی کے مدیر اور گرنی کامگار یونین کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ اور ٹیکسٹائل کی اسٹرائیک میں قیادت کے فرائض ادا کئے۔

اس طرح تمام کمیونسٹوں نے انتہائی جرأت اور بہادری سے اس بات کا اعلان کیا کہ

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں



غزل

سیّد عبدالحمید عدمؔ

عشق — باغ و بہار ہوتا ہے
دل سدا — بے قرار ہوتا ہے

اس کا آنچل ہے — اتنا بارونق
جیسے — عہدِ بہار ہوتا ہے

اس کی آنکھوں کا رنگ — ایسا ہے
جیسے وقتی قرار ہوتا ہے

زلف برہم — لباس آشفتہ
اس طرح بھی — سنگار ہوتا ہے

عشق — انسان کے بس کی بات نہیں
حکم پروردگار — ہوتا ہے

اس کا معصوم جھوٹ — ایسا ہے
جیسے — پھولوں کا ہار ہوتا ہے

اس کی نشوونما — کچھ ایسی ہے
جیسے — پکتا انار ہوتا ہے

کیوں نہ کتنا ہی مختصر ہو سفر
فاصلہ — بے شمار ہوتا ہے

تاج والا — کبھی نہیں ہوتا
بے طلب — تاجدار ہوتا ہے

حسن والوں کو علم ہے اس کا
عشق — اِک اشتہار ہوتا ہے

جو بلا زر کے — خوش رہے ہردم
وہ بڑا مالدار — ہوتا ہے

جس کو دنیا — تباہ کر ڈالے
وہ عدمؔ — بادہ خوار ہوتا ہے

فارغ بخاری



انا الحق

یہ اندھیرا ہی فقط اپنا مقدر تو نہیں
ہم تو اس دھرتی کی ممتا کا ثمر ہیں ایسا
ابتدا ہی سے جو
رنگ اور نور کا پروردہ ہے
روشنی جس کے خد و خال میں ہے
خوشبوئیں جس کے پر و بال میں ہیں
ہم نے دھرتی کو ضیائیں دی ہیں
ننگے پیڑوں کو ردائیں دی ہیں
ہم نے صدیوں کے سسکتے ہوئے ماحول کو
مسکرانے کی ادائیں دی ہیں
زخمی چہروں پہ کھلائے ہیں گلاب
ہم نے سیراب کئے
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے سراب
ہم نے بے خواب دریچوں کو سکوں بخشا ہے

آج تاریک فضاؤں میں ہیں محصور تو کیا
کر دیا ہے ہمیں حالات نے مجبور تو کیا
ہم رہیں یا نہ رہیں
تیشہ زن ہاتھ سلامت ہیں تو کچھ فکر نہیں
ایک ہو کر یہ اٹھیں گے جس دم
شب آلام کے کہسار بھی کٹ جائیں گے
خود بخود فاصلے راہوں کے سمٹ جائیں گے
اس ظلمات کے سینے سے جو تابندہ کرن پھوٹے گی
وہ ہم ہوں گے
ظلم اور جبر پہ جو برقِ فنا ٹوٹے گی
وہ ہم ہوں گے



پروازِ عقاب

زنداں نامۂ ہوچی منہ

عبدالعزیز خالد

(۱)

قیدیوں کے لئے (نہ آج نہ کل،
لالہ و گل کہیں نہ الکوحل
رات کتنی حسین و دلکش ہے!
(اپنی قسمت پہ رشک آتا ہے)،
کس طرح جشن لیکن اس کا منے
(بات بنتی نہیں ہے کیسے بنے؟)
بادکش کے قریب جا کر میں
چاند کے زرنگار پیکر کی
دور ہی سے بلائیں لیتا ہوں
پاس آکر اس جھروکے سے
چاند شاعر پہ مسکراتا ہے
(مژدۂ صبحِ نو سناتا ہے)،

(۲)

منائیں جیل میں وسطِ خزاں کا ہم تہوار
خزاں کے چاند، خزاں کی ہوا، ہے دونوں میں
فسردگی کی مہک، ذائقہ اداسی کا
خزاں کے چاند سے ازبسکہ میں اسیرِ قفس
بقدرِ ذوقِ نظر حظ اٹھا نہیں سکتا
مرا دل اس کی ستاروں جڑی گزرگہ پر
افق سے تا بہ افق اس کے پیچھے پیچھے پھرے!

میں اپنے لہو کا پیاسا نہیں ہوں

محمود شام

میں اکیلا ہوں اور میرا کوئی نہیں
رات دن
شہر کی رونقوں، شور و غل سے بھری شاہراہوں پہ
میں پیاسی آنکھوں، سلگتے لبوں، زرد چہرے پہ تنہائی کی گرد اوڑھے ہوئے
اپنے اندر سمٹتا ہوا
روشنی کے چمک دار تیروں سے بچتا ہوا
موٹروں، تیز کاروں، بسوں، ٹیکسیوں اور ٹرکوں کے قدموں سے پامال
سوتے ہوئے شہر کی چیخیں سنتا ہوں
. . . . روتا ہوں
آپ سب کے لئے وقف ہوں
اپنا احساس کس کو ہے۔ ؟
آوازیں آتی ہیں

تم کچھ نہیں
کچھ نہیں
کچھ نہیں ہو تمہاری حقیقت ہے کیا
.... اور پھر قہقہے .... خوف ... دہشت ...
کبھی اومنی بس کا ہارن بجے
ٹیکسیاں زن سے گزریں
ہوا میں جہازوں کی گھر گھر
. . . . . . سبھی دوسروں کے لئے ہیں
یہاں کوئی اپنے لئے بھی نہیں..."

(۲)

"بابو صاحب! ذرا ایک طرف
.... اور پھر زور سے ایک چابک ؛"
"پچھلی سیٹوں کی جانب...... ذرا بھائی صاحب
ہاں چلو ٹھیک اُستاد جی..."
"ہاں..... نہیں میرا مطلب یہ ہرگز نہیں
درحقیقت میں کہتا ہوں منٹو...
"ذرا ایک کیپسٹن کا سگریٹ
گلاس ایک پانی......"
"ابھی سر! میں حاضر ہوا۔"
"ہاں حدیثوں میں اس کی وضاحت ہے
لیکن......."
"ٹوئنٹی تھری.....!
تم نے ہملٹ تنقید کی وہ کتاب
............"
"سر مگر وہ بڑی بور ہے......
............"
"وہ لڑکی بڑی خوب صورت ہے ممی
وہی موٹی آنکھیں............"
"سڑک پہ تو ہر روز جھاڑو لگاتا ہوں صاحب
مگر میری تنخواہ......"
"خبردار.... ! یو آل! اک دم اٹنشن ......"
"تانگے والا"
"کنڈیکٹر"
ادیب اور نقاد
بیرا
طرحدار عالم

سٹوڈینٹ اور لیکچرر
خاکروب اور حکومت
سبھی ہیں مگر دوسروں کے بنئے ہیں
کہ ان سب کے ذہنوں میں اِک اِک خدا ہے
وہی سب کی منزل ہے،
مقصد ہے،
اس کے خدائی، لباس اور ادائیں
اسی کی طرح زندہ رہنا.....
.......نہیں چند الفاظ میں گفتگو
کوئی اپنی طرح زندہ رہتا نہیں ہے
سبھی اپنے سینوں میں خنجر چلاتے ہیں !
سب راستے ان کے خوں سے رنگے ہیں
کسی کے لئے اپنے ہی قتل کی خواہش !
اور تگ و دو
میں جب دیکھتا ہوں تو روتا ہوں
"اب کوئی اپنے لئے ہی نہیں"
روشنی کی نگاہیں بھی تاریک ہیں
روشنی کے سبھی رنگ مدھم ہیں، بے نور ہیں
.... وہ پرانے مقدس مکانوں کے کہنہ دریچوں سے ہر راہرو کے لئے
رہنمائی کا دعوے لئے اپنی جانب بلاتی ہوئی روشنی ہو
کہ وہ واپڈا کی سسکتی ٹیوبیں
نئی طرز کی بلڈنگوں سے ابھرتی شعاعیں ہوں....
اب سب ہی بے کار ہیں
سبھی اپنی جانب بلاتی ہیں۔
کہتی ہیں...."تم کچھ نہیں ہو۔
کہ ہم اک سمندر ہیں ہم اک حقیقت
ذرا اپنے کپڑے اتار
سمندر میں ڈوبو کہ قطرے کی کوئی حقیقت نہیں ہے
یہ سمندر بھیانک سمندر
شب و روز اب پھیلتے جا رہے ہیں
میرے اب و جد
دوست
بھائی بہنیں اب تو سارے ہی لہروں کے قابو میں ہیں
اور مصیبت تو یہ ہے کہ وہ سارے خوش ہیں
—— مجھے بھی بلاتے ہیں
لیکن....
....نہیں....
میں کسی بھی سمندر میں ملنا نہیں چاہتا
میرے آبا و اجداد کو خون بہانے کا اک شوق تھا
باپ در باپ سب قتل ہوتے رہے
کتنے باپوں نے بیٹوں کو زخمی کیا
.....سرخرو ہو گئے
آج تک قتل کی رسم جاری ہے
سب راستے اُن کے خون سے رنگے ہیں
مقدس کھنڈر میں جہاں روحیں خنجر چلاتی ہیں
تارے بھی تلوار بنتے ہیں
اور رنگینیں سیاہیوں کو چھپاتی ہیں
کالے گناہوں پہ شیطان سزاوار ہوتا ہے
"ہم کچھ نہیں
کچھ نہیں
کچھ نہیں ہیں ہماری حقیقت ہے کیا...."
....ہم تو مٹی کے بس چند ذرے ہیں
جن کا مقدر فنا.....موت.....مٹی
....

یہ دھرتی فقط ایک زنداں ......

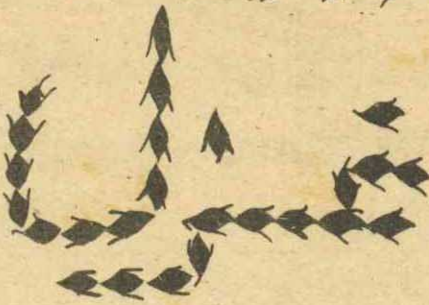
فقط ایک زنداں .....

فلک چاند تارے درخشاں
یہ دھرتی اندھیروں کا مسکن، اجالے فقط آسماں
اور پھر ساری دھرتی لہو میں نہاتے
چمکتی ہوئی رنگتیں کالکوں کو چھپائیں
لہو — کالکیں
رنگتیں،
موت،
مٹی،
اندھیرے
اجالے
..... مگر ان ہیولوں میں کوئی حقیقت ..... !
نہیں..... کچھ نہیں.....
سب کسی کے لئے وقف ہیں
آج سارے کسی ایک زنداں میں محبوس ہیں
میں نے جب آنکھ کھولی
مجھے ہوش آیا
میری والدہ نے مجھے خوب صورت گھروندے دکھائے
....."تیرا باپ تو گھر بنانے کا شوقین ہے۔
اُس نے تیرے لئے اور تیرے سبھی بھائیوں کے لئے گھر بنائے
مجھے سارے گھر پھر دکھائے گئے
یہ سب گھر ہی تیرے لئے ہیں
ادھر دیکھو! یہ روشنی کا مکاں ہے
کبھی تیز آندھی چلے۔
اور گھٹائیں امڈ آئیں
سارے جہاں میں اندھیرے کا جادو چلے
تو تم اس گھر میں آکر پناہ ڈھونڈنا
اور یہ سردیوں کا مکاں ہے
دسمبر کی راتوں میں جب ساری گلیاں ٹھٹھرتی ہواؤں کا رستہ بنیں
ساری سڑکوں، گذرگاہوں پر برف ہی برف ہو
شاہراہیں اداسی کا ملبوس پہنیں
تو ایسے دنوں کے لئے سردیوں کا مکاں ہے
ادھر گرمیوں کا مکاں ہے
یہاں۔ دھوپ، لو اور تپش کا گذر تک نہیں ہے"
میری والدہ چل بسی
باپ زندہ رہا.
پہلے دن میں نے جب گھر کی پچھلی طرف کے کواڑوں کو بھیڑا
دریچے مقفّل کئے
مرا باپ رویا۔ بڑی تیز آندھی چلی
اور اس نے کہا.
"گھر کی پچھلی طرف سے تو منظر بڑا خوبصورت ہے۔
تارے ادھر سے بڑے اچھے لگتے ہیں
اور چاندنی رات بھر ادھر سے ہی گھر میں اترتی ہے۔
...لیکن مجھے آگے بڑھنا ہے
پیچھے سے کیوں روشنی کا تقاضا کروں
میرے پیچھے سے آتی ہوئی روشنی کو مرے
سامنے پھیلتی تیرگی کی خبر کیا
اور میں آج ویسے ہی یہ سارے گھر چھوڑتا ہوں
کہ میں تو کسی گھر میں رہنے کے قابل نہیں
گھر بہت ہیں
بڑے خوب صورت، چمکتے، دمکتے

مگر اب یہ سب قید خانے ہیں میرے لئے
گرمیوں کا مکاں سرد راتوں میں بے کار ہے
سردیوں کا مکاں، گرم موسم میں بے کار ہے
اور اب سردیاں گرمیاں بھی کہاں ہیں
یہاں کوئی موسم نہیں
کہ بس اب تو مہینے ہیں
لمحوں میں ہی زندگی بٹ گئی
... اور لمحوں کی کوئی بھی ترتیب ہوتی نہیں ہے
ہر اک آتا لمحہ گئے لمحوں سے مختلف ہے
ہر اک آتے لمحے کا دامن نئی الجھنیں پیش کرتا ہے
گزرے دنوں کی کوئی بات بھی ان نئی الجھنوں کا مداوا نہیں ہے۔
نئی الجھنوں کے لئے اب نئی روشنی چاہیے۔
میں اب اپنے لئے آپ ہی روشنی ہوں
میں ان میں نہیں ہوں۔
جو اپنے دکھوں کے اندھیرے میں تاروں سے خیرات لیتے ہیں
اور چاندنی کی دعا مانگتے ہیں
خلا میں بکھری ہوئی ہواؤں کے بے رنگ آنچل میں سر کو چھپاتے ہیں
اور سوچتے ہیں۔
"کہ ہم کچھ نہیں ہیں۔
ہوا چاندنی اور ستارے ہی سب کچھ ہیں
یا ٹیکسیاں، موٹریں اور سکوٹر ہیں۔
بس زندگی تو انہیں سے عبارت ہے
... ہم چند لمحے ہیں
آتے ہیں اور بیت جاتے ہیں
ہم کچھ نہیں
کچھ نہیں"

بس یہی ایک زنجیر سب اپنے پیروں میں ڈالے ہوئے گھومتے ہیں
سبھی راستے ان کے خون سے رنگے ہیں
میں ان میں نہیں ہوں
میں اپنے لہو کا پیاسا نہیں ہوں
کہ میرا لہو میری دھرتی کے ذرّوں سے نکلا ہوا رس ہے
میرے لئے زندگی کی سبھی رنگتیں اس سمندر سے ہی پھوٹتی ہیں
میرا خون میری زندگی کے سفر میں
اجالے،
حرارت
رفاقت کا احساس دیتا ہے
کہتا ہے ... تم تو سبھی کچھ ہو
اپنے لئے آپ ہی روشنی ہو۔
ستارے، ہوا۔ چاندنی کچھ نہیں"
"یہ ستارے، ہوا، چاندنی کچھ نہیں۔
آسمان کا یہ پھیلاؤ بھی کچھ نہیں
ایک میں ہوں تو سب کچھ ہی موجود ہے
ورنہ یہ گونجتی زندگی کچھ نہیں
ٹیکسیاں۔ موٹریں شور ہی شور ہیں
ہر طرف پھیلتی روشنی کچھ نہیں
اجلے کپڑوں میں لپٹے ہیں میلے بدن
جھوٹ الفاظ ہیں بندگی کچھ نہیں
آج میرے لئے قید خانے ہیں سب
یہ مکان وہ سڑک وہ گلی کچھ نہیں
میں اب اپنے لئے آپ ہوں روشنی
قہقہے کچھ نہیں، چاندنی کچھ نہیں
ایک میں ہوں تو سب کچھ ہی موجود ہے۔ ورنہ یہ گونجتی زندگی کچھ نہیں۔

صفدر سلیم سیال



آج خوشبو سے گل و گلزار خالی ہو گئے
انقلاب آیا مگر کردار خالی ہو گئے

پوچھتے کیا ہو بدلتے موسموں کے جور سے
ہنستے گاتے سینکڑوں اشجار خالی ہو گئے

جن کے دیکھے سے دمک اٹھتی تھیں دل کی بستیاں
ایسے چہروں سے در و دیوار خالی ہو گئے

ڈوبتے سورج نے یہ منظر بھی دیکھا دوستو!
شام سے پہلے بھرے بازار خالی ہو گئے

ہٹ گئی جب دور میں مظلوم و ظالم کی تمیز
حکمرانوں سے وہی دربار خالی ہو گئے

کیوں لکھی جاتی نہیں پھر داستانِ کربلا
کیا خلوصِ فکر سے فنکار خالی ہو گئے

کونسی منزل پہ لایا ہے مجھے ذوقِ جنوں
تیری یادوں سے مرے اشعار خالی ہو گئے

یک رنگ

نقّاش کاظمی

یہ انجمن بھی عجب ہے یہ داستاں بھی عجیب
سبھی کے ایک سے چہرے سبھی کی ایک سی بات

سبھی کے جسم صلیبانِ خونچکاں کی طرح
سروں کا بوجھ اُٹھاتے، بدن کا درد لئے

کہ جیسے قبر کے کتبات —— مرنے والوں کے
نشان و نام کے ماتم میں سخت افسردہ
تغیرات و تبدل کا شاہکار بنے
کھڑے ہوں پاؤں کے پنجے زمیں میں گاڑے ہوئے
کہ جیسے بوڑھے درختوں کی گیلی گیلی جڑیں
زمیں کی کوکھ سے اِک آسرا لگائے ہوئے
نہ ٹوٹنے کی تمنّا نہ پھوٹنے کا خیال
نہ موت و زلیست کی لذّت نہ آرزوئے جمال
عجب کرب کی صورت عجب درد کی لَے
عجیب رنگ کے نغمے عجیب طرز کی نَے
سبھی کے ایک سے چہرے سبھی کی ایک سی بات


چین اور عوامی کمیون

احفاظ الرحمان

کسان ایک ہوئے تو دھرتی نے اپنے خزانوں کے مُنہ کھول دیئے

آزادی سے قبل چین کے کسان دنیا کے سب سے پسماندہ اور مظلوم کسان تھے۔ وہ صدیوں سے آنسوؤں اور آہوں کی فصلیں کاٹ رہے تھے۔ وہ سال بھر دھرتی کو اپنے لہو سے سینچتے تھے۔ لیکن ان کا سارا سرمایہ جاگیرداروں کے گوداموں میں منتقل ہوجاتا تھا۔ ان کا بال بال مہاجنوں کے پاس گروی ہوتا تھا۔ حکومت نے بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ زمیندار انہیں اپنے لیے بیگار کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ ان کے بدن ننگے رہتے تھے۔ سردیوں میں اپنی جھونپڑیوں کو گرم کرنے کے لیے ان کے پاس کوئلہ تک نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ ٹھٹھر کر مرجاتے تھے۔ بعض اوقات انہیں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اپنے بچوں کو فروخت کرنا پڑتا تھا۔ اگر وہ زمینداروں کے مظالم کے خلاف احتجاج کرتے تو ان کے غنڈے مار مار کر ان کی کھال ادھیڑ ڈالتے تھے۔ جہاں ظلم ہوتا ہے وہاں مزاحمت ضرور ہوتی ہے۔ چین کے کسانوں نے جاگیردار طبقہ کے خلاف متعدد بار بغاوتیں کیں لیکن انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ ان تحریکوں نے ان کے سیاسی شعور کو اور بلند کردیا۔ وہ ظلم کی نشاندہی تو کرسکتے تھے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ نجات کی راہ کہاں ہے۔ کوئی ایسی لیڈرشپ نہیں تھی جو کونے کونے کے کسانوں کو ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک کے ذریعے متحد و منظم کرنے کی کوشش کرتی۔ ملکیت کا تصور ان کے لیے بڑا دلکش تھا حالانکہ ان کی فصل دوسرے کاٹ لے جاتے تھے۔

لیکن چینی کسانوں کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی، صدیوں بعد چینی کمیونسٹ پارٹی نے پچھلے تجربات کی روشنی میں ایک واضح اور ٹھوس راہ عمل کا تعین کیا تو ملک کے تمام مظلوم کسان اس کے پرچم تلے جمع ہوگئے۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ یہ دنیا طبقوں کی دنیا ہے اور ہر طبقہ اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ اور جب ان میں طبقاتی جدوجہد کا شعور پیدا ہوا تو وہ ایک طوفان کی طرح اٹھے اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے جاگیرداری کے بوسیدہ نظام کو زمین بوس کردیا۔

نیا چین ماضی کے کچلے ہوئے کسانوں کا چین تھا جنہیں اس بات کا پورا شعور تھا کہ اگر وہ طبقاتی احساس کو زندہ نہ رکھیں گے تو ایک بار پھر غلامی کی بیڑیاں ان کا مقدر بن جائیں گی۔ جوں جوں ان کا طبقاتی شعور بلند ہوتا گیا، ان میں اجتماعی ملکیت کا احساس بڑھنے لگا۔

چینی کمیونسٹ پارٹی نے ان کی رہنمائی کی اور وہ دھیرے دھیرے "عوامی کمیون" کی منزل کی طرف بڑھنے لگے

صدیوں کی پیاسی دھرتی سونا اگلنے لگی۔ کسانوں کی بجھتی آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ جل اٹھے۔ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے چولھوں سے دھواں اٹھنے لگا۔

صدیوں کی کڑی دھوپ میں جلتے ہوئے جسموں کو کپڑا نصیب ہونے لگا۔ بچے درسگاہوں کا رُخ کرنے لگے۔ کسانوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ اب جب وہ محنت کرتے ہیں تو اس کا پھل کسی "بڑی مچھلی" کے منہ میں نہیں جاتا۔ وہ ایک ہوئے تو دھرتی نے اپنے خزانوں کے مُنہ ان پر کھول دیئے۔ جو زمینیں کل تک ناکارہ تھیں، آج ہُن برسانے لگیں۔ وہ کسان جو کل تک ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے، آج بلند آواز میں کمیون سسٹم کے گیت گا رہے ہیں۔

"عوامی کمیونز کو لبنا ناہی گو یا جنت میں داخلہ ہے
کروڑہا سال کے پھلوں سے ہے شیریں یاں
ایک رات کا پھل۔
کمیونز کے آبدار خنجر سے ملکیت کی جڑیں کٹیں گی
یہیں سے تاریخ کا نیا دور اپنا آغاز کر رہا
ہے۔"

نئے چین نے اپنی تاریخ کے نئے دور کا آغاز کیا تو



وہ طوفان کی طرح اُٹھے اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ کردیا

ماضی کے مفلوک الحال کسان اپنی مشترکہ مساعی سے نئے اور حیرت انگیز کارنامے سرانجام دینے لگے۔ کل تک جن کھیتوں سے فی ایکڑ تین من اناج حاصل ہوتا تھا۔ آج ان سے ۲۵ من اناج حاصل ہوتا ہے۔ کل تک جو زمینیں پیاس سے بلک رہی تھیں۔ آج ان کے سینوں پر نہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے تالاب، آبی ذخیرے اور پن بجلی گھر تعمیر کیے گئے ہیں۔ پہلے سال میں مشکل سے ایک فصل کاٹی جاتی تھی۔ آج چین کے متعدد کمیون سال میں تین فصلیں حاصل کر رہے ہیں۔ کسان نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ پیداوار میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اگر کسی گاؤں میں آتشزدگی کی واردات ہوتی ہے تو کسان اپنے مکانات کو بچانے کی بجائے کمیون کی املاک کا تحفظ کرنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ہر کمیون کے پیداواری بریگیڈوں میں زرعی آلات، جراثیم کش ادویات، کیمیاوی کھاد اور مشین سازی کے چھوٹے چھوٹے کارخانے موجود ہیں۔ ان کارخانوں کے نئے مزدور کسانوں کے بیٹے ہیں جو دھرتی کی مہک سے پوری طرح آشنا ہیں۔ کسی کمیون میں پانی کی کمی ہوتی ہے تو قریبی کمیون اپنی ضروریات کی قربانی دے کر اسے پانی فراہم کرتا ہے۔ کسان راتوں کو اٹھ اٹھ کر کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ایک ایک پودے کی نشوونما پر نظر رکھتے ہیں۔ کسی پودے میں کیڑا لگ جائے یا اس کی نشوونما رک جائے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ پہلے جو علاقے سیلاب کی زد میں آتے تھے آج وہاں بڑے بڑے پشتے بنے ہوئے ہیں۔ ننگے پہاڑوں پر مٹی کی تہیں بچھا کر ان پر فصلیں اگائی جا رہی ہیں۔ ہر کمیون میں ان گنت پرائمری اور مڈل اسکول کھلے ہوئے ہیں، جہاں عام کسان بچوں کو زراعت کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ہر بچہ مفت تعلیم حاصل کرتا ہے۔ بیماریوں کے علاج کے لیے ہر بریگیڈ میں کلینک موجود ہیں۔ کمیون کی سطح پر بڑے بڑے ہسپتال ہیں۔ جہاں مریضوں کے آپریشن بھی کیے جاسکتے ہیں۔ وہ دو تین روپے ادا کرتے ہیں اور سال بھر مفت علاج کراتے ہیں۔ کسانوں کے گھر صاف ستھرے ہیں۔ بیشتر گھروں میں ریڈیو، الماریاں، سلائی کی مشینیں اور بائیسکل موجود ہیں۔

یہ کوئی افسانہ نہیں ہے۔ چین میں ساڑھے تین سال کے قیام کے دوران میں نے مختلف صوبوں میں ان گنت کمیونوں کے دورے کیے ہیں اور یہ سب


ایک کمیون کے
کارخانے کی ایک مزدور


شیا فشوا ای بریگیڈ کے کسانوں کے ساتھ
جنہوں نے بنجر پہاڑ پر مٹی کی تہیں بچھا کر اسے قابلِ کاشت بنادیا


تسیا چاؤ کمیون کے سوئی تانگ اسکول
کی ایک کلاس


تسیچو ...
بریگیڈ کے کسانوں کے ساتھ



شیاشوای بریگیڈ کے کسانوں کے ساتھ

باتیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں میں نے چین کے اس کسان کو دیکھا ہے جو ایک نئے عزم کے ساتھ، اجتماعی مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے عظیم وطن کی تعمیر میں سرگرمی سے اپنا حصہ ادا کر رہا ہے اسے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں اس کے طبقاتی بھائی آج بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے وطن کی تعمیر میں حصہ لے کر اپنے ان بھائیوں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اسے اس بات کا بھی علم ہے کہ اس کے طبقاتی دشمن آج بھی سرمایہ داری اور جاگیرداری کی بحالی کا خواب دیکھ رہے ہیں جس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انقلاب کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خود کو نظریاتی ہتھیاروں سے لیس کرتا ہے اور ان کی تمام سازشوں کو ناکام بناتا ہے۔

چین کے کسانوں نے یہ مقام ایک شدید جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر چینی کمیونسٹ پارٹی نہ ہوتی اور انہیں عظیم مفکر ماؤزے تنگ کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو آج چین کے کسان کمیون سسٹم کی منزل پر نہ ہوتے۔

آزادی کے بعد چین کے کسانوں نے کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں وسیع پیمانے پر زرعی اصلاحات کی مہم شروع کی۔ آزادی سے قبل سرخ علاقوں کے کسان تجربے کی اس منزل سے گزر چکے تھے اس لیے انہیں زیادہ مشکلات پیش نہیں آئیں۔ ان اصلاحات کے طفیل پیداوار میں اضافہ ضرور ہوا لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اجتماعیت کاری اور مشین کاری کا مرحلہ شروع ہوا۔ کسانوں نے امدادِ باہمی کی ٹیمیں بنائیں اور مِل جل کر کام کرنے لگے۔ امدادِ باہمی کی ٹیمیں تیس چالیس گھرانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس سسٹم کے تحت زمین، مویشی اور زرعی آلات نجی ملکیت میں ہوتے تھے۔ اس کے اراکین بس کام کے سلسلے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور اجتماعی طور پر تمام کھیتوں میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔

ہر چند یہ طریقہ زیادہ مؤثر نہیں تھا لیکن بعد میں اسی عمل نے کسانوں میں انفرادی ملکیت کے "دِلکش تصوّر" کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ انفرادی ملکیت کا تصوّر دراصل روزی کی ضمانت کے تصوّر سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب لوگوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان کی روزی کے وسائل محفوظ ہیں تو وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اور کسی شے پر اپنا نام تحریر کرنے پر اصرار نہیں کرتے۔

یہاں محنت کا پھل کسی بڑی مچھلی کے منہ میں نہیں جاتا

امدادِ باہمی کی ٹیموں کے بعد نیم سوشلسٹ امداد باہمی کی انجمنوں کا مرحلہ آیا۔ ان انجمنوں کا دائرہ زیادہ بڑا تھا۔ اراکین کی تعداد زیادہ تھی۔ تمام اراکین کی زمینیں اور ان کے اہم آلاتِ پیداوار اجتماعی ملکیت بن گئے "ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق، ہر شخص کو اس کی محنت کے مطابق" کے اصول پر عمل کیا جانے لگا۔ لیکن ان لوگوں کو مخصوص مراعات حاصل تھیں جنہوں نے زیادہ بڑی زمینیں یا زیادہ آلاتِ پیداوار اجتماعی فنڈ میں جمع کرائے تھے۔

سوشلسٹ امداد باہمی کی انجمنوں میں بھی تمام زمینیں اور اہم پیداواری آلات اجتماعی ملکیت میں تھے لیکن ہر شخص کو اس کی محنت کے مطابق حصہ ملتا تھا۔ کسی کو کوئی مخصوص مراعات حاصل نہیں تھیں، خواہ اجتماعی فنڈ میں شامل شدہ اس کی زمین دوسروں کے مقابلے میں بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ سوشلسٹ امدادِ باہمی کی انجمنوں میں عام طور پر تقریباً دو سو گھرانے شامل ہوتے تھے۔ اس طرح اس کا دائرہ نیم سوشلسٹ ادر امدادِ باہمی کی انجمنوں سے بڑا تھا۔ ان انجمنوں کا انتظام ایک مشترکہ قیادت کے ذمے ہوتا تھا۔ ۱۹۵۷ تک تقریباً پورے ملک میں اس قِسم کی انجمنوں کا قیام عمل آ چکا تھا۔ ان انجمنوں کے قیام کے بعد اناج کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا اور تاریخ کے پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹنے لگے۔ ان کامیابیوں کی بدولت کسانوں میں اجتماعیت کا جذبہ پہلے سے بھی بلند ہو گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ اپنی ان انجمنوں کو فروغ دینے کی کوشش کرنے لگے۔

۱۹۵۷ء کے بعد بہت سے مقامات پر امدادِ باہمی کی چھوٹی چھوٹی انجمنیں ایک دوسرے میں ضم ہونے لگیں بعض مقامات پر امدادِ باہمی کی انجمنوں نے آپس میں فیڈریشن بنا لیا۔ عام طور پر اس قسم کے فیڈریشن میں ہزاروں افراد پر مشتمل قصبوں کے تمام گھرانے شامل ہو گئے تھے انتظامی گروپ قصبوں کی مقامی حکومتوں سے منسلک ہوتا ہے اس طرح قصبوں میں سیاسی اور معاشی تنظیم کی ایک نئی شکل سامنے آنے لگی۔

اس کے بعد عوامی کمیونوں کا دَور شروع ہوتا ہے۔ صدر ماؤ نے کہا ——— "عوامی کمیون اچھے ہیں" کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے کمیونوں کی تشکیل کے سلسلے میں قواعد و ضوابط کے بارے میں ایک قرارداد جاری کی۔ لوگ پہلے ہی سے ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہونے لگے۔ چنانچہ وہ تنظیم جسے شروع میں امدادِ باہمی کی انجمن کہتے تھے کمیون کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ کمیونوں میں عام طور پر لاکھوں افراد شامل ہوتے ہیں۔

کمیون نے چین کے دیہی علاقوں میں نئی پرولتاری سیاسی قوّت کی بنیادی علامت ہیں۔ کمیون کی لیڈرشپ نہ صرف زرعی امور کی نگرانی کرتی ہے بلکہ مقامی طور پر سیاسی اقتدار کے تمام اختیارات بھی اسی کو حاصل ہوتے ہیں۔ کمیون چین کے دیہی علاقوں میں سوشلسٹ سماج کی بنیادی علامت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چین کے کمیون پیداواری بریگیڈوں میں اور بریگیڈ ٹیموں میں منقسم ہوتے ہیں۔ ان تینوں سطحوں پر اجتماعی

نیا چین غریبوں اور محنت کشوں کا وطن ہے

ملکیت کا نظام نافذ ہے۔ زمین، مویشی، زرعی آلات اور دوسرے تمام اہم وسائلِ پیداوار اجتماعی ملکیت ہوتے ہیں۔ ٹیم سب سے چھوٹا اور بنیادی یونٹ ہے وہ اپنی آمدنی کو اپنی ضروریات کے مطابق صرف کرتی ہے۔ منافع کا ایک حصہ کسانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ایک حصہ کمیون کی انقلابی کمیٹی کو ٹیکس کے طور پر ادا کیا جاتا ہے اور ایک حصہ آئندہ منصوبوں کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ ٹیم کا دائرہ کار نسبتاً محدود ہوتا ہے۔ وہ ایک محدود سے رقبے میں زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن نسبتاً بڑے پروجیکٹوں پر کام کرنے کے لیے اس کے پاس وسائل نہیں ہوتے۔ اس قسم کے کام بریگیڈ کے ذمے ہوتے ہیں۔ بریگیڈ چھوٹے آبی ذخیرے تعمیر کرتے ہیں اور اسکولوں، طبی مراکز، ضمنی مصنوعات اور باغات کا انتظام سنبھالتے ہیں دوسری قسم کے چھوٹے موٹے ترقیاتی منصوبے بھی اسی کے سپرد ہوتے ہیں۔ چین کے بیشتر دیہات کے بریگیڈوں میں زرعی آلات کے چھوٹے کارخانے موجود ہیں۔

اسی طرح جو کام بریگیڈ سر انجام نہیں دے سکتے، وہ کمیون کے زیرِ نگرانی ہوتے ہیں۔ کمیون کی انقلابی کمیٹی کے ارکان سب سے بڑی انتظامی باڈی کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ مرکزی باڈی بڑے بڑے منصوبوں پر کام کرتی ہے۔ بڑے آبی ذخیرے اور پن بجلی گھر تعمیر کرتی ہے۔ ٹریکٹر اور دوسری زرعی مشینوں کے کارخانے قائم کرتی ہے، جنگل کاری اور نقل و حمل کا انتظام کرتی ہے سینیئر مڈل اسکول اور بڑے ہسپتالوں کا نظم و نسق سنبھالتی ہے اور زراعت، ماہی گیری، افزائشِ مویشیاں اور دوسرے ضمنی پیشوں کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہے۔

کمیون مقامی صنعتوں کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ بیشتر کمیون خود انحصاری کے اصول کے تحت اپنی بنیادی ضروریات کی اشیا خود تیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قسم کی اشیاء کے لیے دوسروں کے محتاج نہیں ہوتے ہر کمیون میں زرعی مشینوں کی مرمت کے کارخانے موجود ہیں۔ کمیون قدرتی آفات کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف قسم کے پروجیکٹ بناتے ہیں۔ جدید سائنسی طریقوں سے کاشت کاری کرنے اور زمین کو زرخیز بنانے کے لیے تجربات کرتے ہیں؟

یہ سمجھنا غلط ہے کہ کمیون کا تعلق صرف زراعت سے ہوتا ہے۔ کمیون کے تحت صنعت اور تجارت کے شعبوں میں بھی کام ہوتا ہے۔ طب اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے بھی مختلف قسم کے منصوبوں پر عملدر آمد کیا جاتا ہے۔ کمیون کے تحت ملیشیا کے دستے قائم کیے جاتے ہیں جہاں اس کے اراکین کو فوجی تربیت دی جاتی ہے۔ کسانوں کو نظریاتی تعلیم دی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً ان کی میٹنگیں بلائی جاتی ہیں جہاں وہ مختلف امور پر اپنی اپنی تجویزیں پیش کرتے ہیں کسان مل جل کر مارکسزم، لینن ازم، فکر ماؤ زے تنگ کا مطالعہ کرتے ہیں اور آپس میں تبادلۂ تجربات کرتے ہیں جو کسان اَن پڑھ ہیں، انہیں سیاسی اور نظریاتی مضامین پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔

انقلابی کمیٹی اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ اسے اوپر کے اداروں سے کسی قسم کی مدد نہ لینی پڑے وہ تمام منصوبوں کی تکمیل میں خود انحصاری کے اصول کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں جب کمیون کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں کاؤنٹی صوبے یا مرکز سے مدد لیتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں پروجیکٹ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ کمیون اپنے محدود وسائل سے ان کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ پھر عام طور پر ایسے پروجیکٹوں کا تعلق کسی مخصوص کمیون سے نہیں ہوتا بلکہ ان کا دائرۂ اثر بہت سے کمیونوں یا پوری کاؤنٹی تک پھیلا ہوتا ہے پیداواری ٹیموں، بریگیڈوں اور کمیونوں کے رہنما سیاسی اور انتظامی ادارے کا انتخاب عام کسان کرتے



ایک ستر (۷۰) سالہ بوڑھا پیداواری محنت میں حصہ لے رہا ہے

عوامی کمیون نے دیہی علاقوں کو خود کفیل بنا دیا



شیا چاؤ کمیون کے ماہی گیر مچھلیاں پکڑ رہے ہیں

کمیون کا مطلب

—— اجتماعی ملکیت، اجتماعی جدوجہد

عورتوں اور مردوں کی اجرتوں میں کوئی فرق نہیں

ہیں۔ ہر کسان کو ووٹ دینے، منتخب ہونے اور منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ چین کے کسانوں کا سیاسی شعور اتنا بلند ہو چکا ہے کہ وہ عام طور پر اہل افراد ہی کو ذمے دار عہدوں کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ ہر کسان کو مارکسزم کی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ کمیون کے اراکین ہفتے میں ایک بار مقررہ وقت تک سیاسی مطالعہ کرتے ہیں پڑھے لکھے کسان اپنے ان پڑھ طبقاتی بھائیوں کی مدد کرتے ہیں۔ بہت سے بوڑھے کسان جنہیں ماضی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا، اپنے بچوں سے سبق لیتے ہیں۔ کمیون، بریگیڈ اور ٹیم سال کے شروع میں اپنی ضروریات اور وسائل کی روشنی میں، مرکزی حکومت کی توقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پیداواری منصوبوں کا تعین کرتے ہیں۔ کمیون کے تمام اراکین ان منصوبوں کے سلسلے میں اپنی تجویزیں پیش کرتے ہیں جس کے بعد ان منصوبوں کو آخری شکل دے دی جاتی ہے۔ آج کل چین میں اس قسم کی مثالیں عام ہیں کہ کمیون، بریگیڈ اور ٹیمیں مقررہ وقت سے قبل اپنے سالانہ منصوبوں کی تکمیل کر لیتی ہیں یہ بھی کسانوں کے بلند سیاسی شعور کا کرشمہ ہے۔ وہ اس جذبے کے ساتھ کام کرتے ہیں کہ چین ایک ترقی پذیر ملک ہے جسے سامراجی قوتیں چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کر رہی ہیں، اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کرنی چاہیے۔ پھر وہ اس بات کو بھی ذہن میں رکھتے ہیں کہ دنیا کے بہت سے ممالک کے کروڑوں محنت کش ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہیں اور اگر چین ترقی کرے گا تو وہ زیادہ مؤثر انداز میں ان کی حمایت کر سکے گا۔

کمیونوں کی آمدنی، پیداواری اور انتظامی اخراجات نکالنے کے بعد، تین حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ آمدنی کا پانچ چھ فیصد حصہ حکومت کو ٹیکس کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ ٹیکس کی یہ شرح ہمیشہ یکساں رہتی ہے اور اس میں کبھی اضافہ نہیں کیا جاتا۔ آمدنی کا دوسرا حصہ اجتماعی فنڈ میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس فنڈ سے ضروری آلات، مشینیں کیمیاوی کھاد، جراثیم کش ادویات اور دوسرا سامان خریدا جاتا ہے اور اسے اگلے سال کے پیداواری منصوبوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس فنڈ سے سماجی فلاح و بہبود کے کام کیے جاتے ہیں۔ اسکولوں اور ہسپتالوں پر بھی اسی مد سے سرمایہ صرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ معذور افراد اور ان کنبوں کو جن میں کام کرنے والے افراد کی تعداد کام نہ کرنے والے افراد سے بہت کم ہو، بھی اسی فنڈ سے امداد دی جاتی ہے۔ تیسرا حصہ جو سب سے بڑا ہوتا ہے، کمیون کے اراکین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

اجرت کی تقسیم —— "ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق، ہر ایک کو اس کی محنت کے مطابق" کے اصول کے تحت ہوتی ہے۔ عام طور پر نوجوان سب سے زیادہ WORKING POINTS حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی اجرت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ عورتوں اور مردوں کی اجرتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ہر کمیون ممبر کے پاس اس کے اہل خاندان کی تعداد کے اعتبار سے نجی زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ بھی ہوتا ہے جس پر وہ کاشت کاری کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک مقررہ تعداد میں مویشی، مرغیاں اور بطخیں بھی پال سکتا ہے۔

صدر ماؤ نے ایک بار چین کے کسانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا —— "کمیون عمدہ ہیں!" چین کے کمیونوں کی حیرت انگیز ترقی سے ان کے اس مقولے کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے۔ کمیون سسٹم کی بدولت آج چین کے دیہی علاقوں میں ہر طرف خوشحالی کا سماں نظر آتا ہے۔ بہت سے کسانوں کے گھروں میں بنیادی ضروریات کی اشیاء کے علاوہ سلائی کی مشین، ریڈیو اور بائیسکل بھی موجود ہیں۔ ان کے پاس پہلے ہی سے کھانے کے لیے سال بھر کا اناج محفوظ ہوتا ہے اس لیے وہ پوری دلجمعی کے ساتھ پیداواری محنت میں حصہ لیتے ہیں سوشلسٹ نظام انہیں روزی کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور وہ اپنی محنت سے سوشلسٹ نظام کی کامیابی کی راہیں کھولتے ہیں



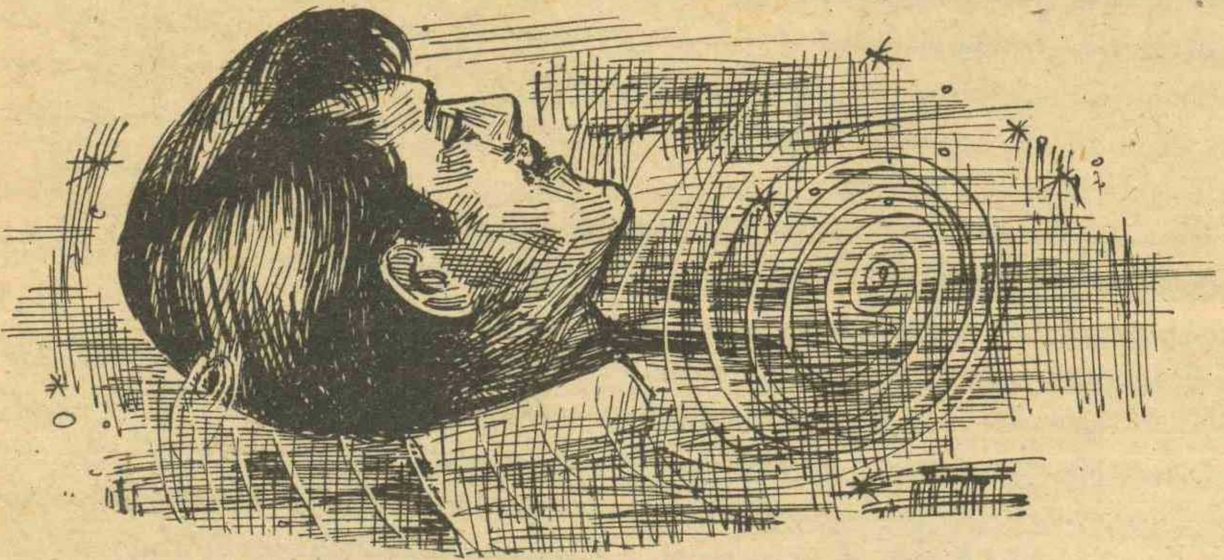
تشیاچاؤ کمیون کا ایک دلکش منظر

میں اگر مثالیں لکھنے بیٹھوں تو صفحات کے صفحات سیاہ ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کمیون سسٹم نے چین کے کسانوں میں انفرادی مفادات کو اجتماعی مفادات پر قربان کرنے کا ٹھوس جذبہ بخشا ہے —— "میں" "ہم" سے بدل چکا ہے۔ چین کے کسان اس بات کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں کہ دنیا کی تمام برائیاں اس وقت جنم لیتی ہیں جب "تیری" اور "میری" کا سوال اٹھتا ہے

آج بہت سے کسان کمیونوں، کاؤنٹیوں، صوبوں اور مرکز میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ بہت سے کسانوں کو کانگریس کی رکنیت تک حاصل ہو چکی ہے۔ یہ نئے چین کا نیا کسان ہے۔ اسے معاشرے میں سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ اس کا پیشہ ایک مقدس پیشہ ہے۔ ماضی کی طبقاتی جدوجہد اس کے ذہن میں اب تک تازہ ہے، اسی لیے وہ نئے سوشلسٹ نظام کی کامیابی کے لیے دل و جان سے کام کرتا ہے اس نئے نظام نے اسے ذلت کی پستیوں سے اٹھا کر ایک بلند مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

نیا چین انہی غریبوں اور محنت کشوں کا وطن ہے جو اسے روز بروز ایک نئی کامیابی سے ہمکنار کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر افسانے "نیند نہیں آتی" اور "دلّی کی سیر" ترقی پسند افسانہ نگاروں کے پہلے مجموعے "انگارے" سے لئے گئے ہیں۔ "انگارے" میں ہندوستان کے ان بیباک نوجوان ادیبوں کی تخلیقات شامل تھیں جو ایک ایسے نظام کے علمبردار تھے جس میں کسی قسم کا استحصال نہ ہو۔ باغی ادیبوں کا یہ مجموعہ بازار میں آیا تو پورے ہندوستان میں آگ لگ گئی۔ فرنگی حکومت کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور اس نے "انگارے" کی تمام کاپیاں ضبط کر لیں۔ (ادارہ)



نیند نہیں آتی

سجّاد ظہیر

گھڑ۔ گھڑ۔ گھڑ۔ گھڑ۔ ٹخ۔ ٹخ۔ چٹ۔ ٹخ۔ ٹخ۔ ٹخ۔ چٹ۔ چٹ۔ چٹ

گذر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے ۔۔۔ ے ۔۔۔۔ ے ۔۔۔۔ خاموشی اور تاریکی۔ تاریکی۔ تاریکی۔ آنکھ ایک پل کے لئے کھلی۔ تکیہ کے غلاف کی سفیدی، تاریکی، مگر بالکل تاریکی نہیں، مگر آنکھ پھر بند ہو گئی۔ مگر پوری تاریکی نہیں۔ آنکھ دبا کر بند کی۔ پھر بھی روشنی آہی جاتی ہے۔ پوری تاریکی کیوں نہیں ہوتی؟ ۔ کیوں نہیں۔؟ کیوں نہیں۔؟

بڑا میرا دوست بنتا ہے۔ جب ملاقات ہوئی۔ آئیے اکبر بھائی۔ آپ کے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ کچھ تازہ کلام سنائیے ۔۔۔۔ لیجئے سگریٹ نوش فرمائیے۔ مگر سمجھتا ہے۔ شعر خوب سمجھتا ہے۔ وہ دوسرا تو اُلّو کا پٹھا بالکل خر دماغ ہے۔ اخاہ! آج تو آپ اپنی نئی اچکن پہنے ہیں ۔۔۔۔ تیرے باپ کا کیا اگر میں نئی اچکن پہنے ہوں۔ تو چاہتا ہے کہ بس ایک تیرے ہی پاس نئی اچکن ہو۔ اور شعر سمجھنا تو درکنار صحیح پڑھ بھی نہیں سکتا۔ ناک میں دم کر دیتا ہے۔ بےہودہ۔ بدتمیز کہیں کا۔ مگر بڑا بھائی میرا دوست بنتا ہے۔ ایسوں کی دوستی کیا۔ میری باتوں سے اُس کا جی بہل جاتا ہے۔ بس یہی دوستی ہے۔ مفت کا مصاحب مارا، چلو مزے ہیں ۔۔۔۔ خدا سب کچھ کرے کسی کو غریب نہ کرے، دوسروں کی خوشامد کرتے کرتے زبان گھس جاتی ہے اور وہ ہیں کہ چار پیسے جو جیب میں ہم سے زیادہ ہیں تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ میں نے آخر ایک دن کہہ دیا کہ میں نوکر ہوں کوئی آپ کا غلام نہیں۔ تو بجیا آنکھیں نکال کر لگا دیکھنے مجھے۔ بس جی میں آیا کہ کان پکڑ کر ایک چانٹا رسید کروں، سالے کا مزاج درست ہو جائے۔

ٹپ۔ ٹپ۔ کھٹ ٹپ ٹپ کھٹ ٹپ ٹپ کھٹ، ٹپ ٹپ ٹپ ۔۔۔۔ ٹ ۔۔۔۔

اس وقت رات کو یہ آخر کون جا رہا ہے۔؟ مرن ہے اس کی، اور کہیں پانی برسنے لگے تو اور مزا ہے۔ لکھنؤ میں جب میں تھا، ایک جلسہ میں۔ موسلا دھار بارش، امین الدولہ پارک تالاب معلوم ہوتا تھا۔ مگر لوگ ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اور کیا ہے کیا جوہیں سب جان پر کھیلنے کو تیار ہیں۔ مہاتما گاندھی کے آنے کا انتظار ہے۔ اب آئیں۔ تب آئیں۔ وہ آئے۔ آئے۔ آئے۔ وہ مچان پر مہاتما جی پہنچے ۔۔۔۔ جے ۔۔۔۔ جے ۔۔۔۔ جے ۔۔۔۔ خاموشی۔

میں آپ لوگوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ لوگ بدیشی کا پڑ پہننا بالکل چھوڑ دیں۔ یہ شیطانی گورن منٹ ۔۔۔۔ یہاں پانی سر سے ہو کر پیروں سے پرنالوں کی طرح بہنے لگا۔ قدرت موت رہی تھی۔ شیطانی گورنمنٹ شیطانی، گورنمنٹ کی نانی۔ اس گاندھی سے شیطانی گورنمنٹ کی نانی مرتی ہے۔ آہاہا، شیطانی اور نانی ۔۔۔ اکبر صاحب، آپ تو ماشاء اللہ شاعر ہیں۔ کوئی قومی نظم تصنیف فرمائیے۔ یہ گل و بلبل کے افسانے کب تک۔ قوم کی ایسی تیسی! میرے ساتھ قوم نے کیا اچھا سلوک کیا ہے کہ میں گل و بلبل چھوڑ کر قوم کے آگے تھر کوں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ میں نے آخر کسی کے ساتھ کیا برا سلوک کیا ہے کہ سارا زمانہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہے۔ میرے کپڑے میلے ہیں ۔۔۔۔ ان سے بدبو آتی ہے ۔۔۔۔ بدبو سہی۔ میری ٹوپی دیکھ کر کہنے لگا کہ تیل کا

دھبہ پڑ گیا۔ نئی ٹوپی کیوں نہیں خریدتے؟

کیوں خریدوں نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے۔

انگشت نما تھی کج کلاہی جن کی ـ وہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں آج

ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو.....

واہ وا واہ! کیا بے تکا پن ہے۔ جارج پنجم کے تاج میں ہمارا ہندوستانی ہیرا ہے۔ لے گئے چرا کے انگریز، رہ گئے نہ منہ دیکھتے! اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئی دُم ہاتھ میں۔ آپ چاہتے ہیں کہ دُم بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ دُم نہ چھوٹنے پائے۔ شاباش ہے میرے پہلوان! لگائے جا زور! دُم چھوٹی تو عزت گئی۔ کیا کیا عزت؟ عزت لے کے چاٹنا ہے۔ سوکھی روٹی اور نمک کھا کر کیا بابا کا جسم نکل آیا ہے۔ فاقہ ہو تو پھر کیا کہنا۔ اور اچھا ہے۔ پھر تو بس عزت ہے اور عزت کے اوپر خداوند پاک..... خداوند پاک اللہ باری تعالیٰ، رب العزت، پرمیشر، پرماتما۔ لاکھ نام لے جاؤ۔ جلدی۔ جلدی۔ جلدی۔ جلدی اور جلدی۔ کیا ہوا؟ روحانی سکون؟ بس تمہارے لئے یہی کافی ہے۔ مگر میرے پیٹ میں تو دوزخ ہے۔ دعا کرنے سے پیٹ نہیں بھرتا، پیٹ سے ہوا نکل جاتی ہے۔ بھوک اور زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

بھوں۔ بھوں۔ بھوں.....

اب ان کا بھونکنا شروع ہوا تو رات بھر جاری رہے گا۔ مچھر الگ ستا رہے ہیں۔ توبہ ہے توبہ! ایک جالی کا پردہ گرمیوں میں بہت آرام دیتا ہے۔ مچھروں سے نجات ملتی ہے۔ مگر کیا نجات کیا! دن بھر کی مشقت چیخ و پکار، کڑی دھوپ میں گھنٹوں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے گھومتے جان نکل جاتی ہے۔ اماں کہا کرتی تھیں، اکبر دھوپ میں مت دوڑو، آ میرے پاس آ کر لیٹ میرے بچے! لُو لگ جائے گی تجھے بچے۔ ایک مدت ہوگئی۔ اُسے بھی۔ اب تو یہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں اور مولوی صاحب ہمیشہ میری تعریف کرتے تھے۔ دیکھو نا لا لقو! اکبر کو دیکھو، اسے شوق ہے علم کا، خواب، وہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ میں بستہ تختی لئے دوڑتا ہوا واپس آتا تھا۔ اماں گود سے چپٹا لیتی تھیں۔ مگر کیا آرام تھا! اس وقت بھی کیا آرام تھا۔ یہ سب چیزیں میری قسمت میں ہی تھیں۔ مگر میں جو مصیبت برداشت کر چکا ہوں شاید ہی کسی کو اٹھانی پڑی ہو۔ اسے یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ خیراتی ہسپتال، نرسیں، ڈاکٹر، سب ناک بھوں چڑھائے اور اماں کا یہ حال کہ کروٹ لینا محال اور ان کے اُگالدان میں خون کے ڈلے کے ڈلے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گوشت کے لوتھڑے ہیں..... اور میں سب کو خط پہ خط لکھتا تھا۔ یہی جو سب رشتہ دار بنتے ہیں! آیئے اکبر بھائی آیئے! آپ سے تو برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی..... یہی! انہیں کے ماں، باپ کیا ہو جاتا اگر ذرا اور مدد کر دیتے۔ دنیا بھر کی خرافات پر پانی کی طرح دولت بہاتے ہیں۔ کسی رشتہ دار کی مدد کرتے وقت مل مل کر پیسے دیتے ہیں اور پھر احسان جتانا، اتنا کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن کہیں میں باہر گیا ہوا تھا۔ انہیں صاحبزادے کی والدہ اماں کو دیکھنے آئیں۔ میں جب پہنچا تو انہیں آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے۔ چہرہ سے ٹپک رہا تھا کہ انہیں ڈر ہے کہ جراثیم ان کے سینے کے اندر نہ گھس جائیں۔ مگر بیمار کو دیکھنے آنا فرض ہے۔ ثواب کا کام ہے۔ یہ سب تو سب انہوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ الجھاں لگے تھے۔ تم اپنی والدہ کو چھوڑ کر۔ ان کی حالت ایسی نہیں کہ انہیں اس طرح چھوڑا جائے..... مریض کے منہ پر اس طرح کی باتیں میں غصہ سے کھولنے لگا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ ہسپتال کا خرچ انہیں لوگوں سے لیتا تھا۔ میرے بیوی بچوں کا ٹھکانہ انہیں کے یہاں تھا..... میری شادی کی۔ جس نے سنا مخالفت کی لیکن امی کا سب سے بڑا ارمان میری شادی تھی۔ اکبر کی دلہن بیاہ کے لاؤں، بس میری یہ آخری تمنا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ گھر میں کھانے کو نہیں۔ شادی کس برتے پر کروگی۔ اماں کہتی تھیں کہ خدا رزاق ہے۔ جب میری نسبت طے ہوگئی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ شادی کا دن آ گیا۔ تو وہی لوگ جو مخالفت کرتے تھے بارات میں جانے کو تیار ہو کر آ گئے۔ ساری کچی بچائی پونجی اماں کی مہمان داری اور شادی کے لوازمات میں خرچ ہوگئی۔ گیس کی روشنی، ریشمی چکنیں۔ پلاؤ۔ باجہ، مسند، ہنسی مذاق، بھیڑ، کھانے میں کمی پڑ گئی۔ باورچی نے چوری کی۔ بادشاہ علی صاحب کا جوتا چوری ہو گیا۔ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ ابے اُلو کے پٹھے تو نے جوتا سنبھال کر کیوں نہیں رکھا۔ جی حضور، قصور میرا نہیں..... میر کا جھگڑا ہونا شروع ہوا۔ موجل اور معجل کی بحث، منہ دکھائی کی رسم، مذاق، چہول، گالی گلوچ، شادی ہوگئی۔ اماں کا ارمان پورا ہوگیا..... محرم علی بے چارا چالیس برس کا ہو گیا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی۔ اکبر میاں شادی کروا دیجئے۔ شیطان رات کو بہت ستاتا ہے۔ شادی، خوشی، کوئی ہمدرد، بات کرنے والا جس سے اپنے دل کی ساری باتیں اکیلے سنا دیں۔ کوئی عورت جس سے محبت کر سکیں، دو گھڑی ہنسیں بولیں، چھاتی سے لگائیں۔ پیار کریں۔ ارے مان بھی جاؤ میری جان، میری پیاری، میری سب کچھ، زبان بے کار ہے۔ ہاتھ، پیر، سارا جسم۔ جسم کا ایک رونگٹا..... کیوں آج مجھ سے خفا ہو۔ بولو! ارے تم نے تو رونا شروع کر دیا۔ خدا کے واسطے بتاؤ آخر کیا بات ہے۔ دیکھو، میری طرف دیکھو تو سہی۔ وہ آئی ہنسی، وہ ہونٹوں پر، بس اب ہنس تو دو، کیا دو دن کی زندگی میں رونا دھونا۔ اُفوہ، یوں نہیں یوں، اور... اور.... اور.... زور سے میرے سینے سے لپٹ جاؤ..... لکھنؤ کے کوٹھوں کی سیر میں نے بھی کی ہے۔ ایسا غریب نہیں ہوں کہ دور ہی دور سے رنڈیوں کو دیکھ کر سسکیاں لیا کروں۔

آیئے حضور اکبر صاحب! یہ کیا ہے جو مدتوں سے ہماری طرف رخ ہی نہیں کرتے۔

ادھر کوئی نئی چلتی ہوئی غزل کہی ہو تو عنایت فرمایئے۔ گا کر سناؤں۔ لیجئے پان نوش فرمایئے۔ لے لو۔ اور لو، ذرا دم تو لیجئے۔ نہیں آج تو معاف فرمایئے، پھر کبھی۔ میں تو آپ کی خادم ہوں..... روپے کی غلام سمجھتی ہے میرے پاس ٹکے نہیں۔ روپے دیکھ کر راضی ہوگئی۔ کیا سناؤں حضور؟..... طبلہ کی تھاپ، سارنگی کی آواز، گانا بجانا پھر تو میں تھا۔ وہ تھی، ساری رات تھی۔ نیند جیسے آتی ہو وہ کافر۔ یہ راتوں کا جاگنا، دوسرے دن درد سر، تھکاوٹ، بدمزگی، اماں کی بیماری کے زمانے میں۔ ان کی پلنگ کی پٹی سے لگ گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ اور ان کی کھانسی۔ کبھی کبھی تو مجھے خود ڈر معلوم ہونے لگتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر کھانسی کے ساتھ ان کے سینے میں ایک گہرا زخم پڑ گیا۔ ہر سانس کے ساتھ جیسے زخموں پر سے کسی نے تیز چھری کی باڑھ چلا دی۔ اور وہ گھرگھراہٹ جیسے کسی پرانے کھنڈر میں لو چلنے کی آواز ہوتی ہے۔ ہولناک مجھے اپنی ماں سے ڈر معلوم ہونے لگتا۔ اس ہڈی چمڑے کے ڈھانچے میں میری ماں کہاں! میں ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھتا۔ دھیرے سے دباتا، ان کی ادھ کھلی بند آنکھیں، میری طرف مڑتیں۔ ان کی نظر مجھ پر ہوتی۔ اس وقت، اس شکستہ، پامال، مردہ جسم بھر میں بس آنکھیں زندہ ہوتیں۔ ان کے ہونٹ ہلتے۔ اماں۔ اماں! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں، جی! میں اپنا کان ان کے لبوں کے پاس لے جاتا۔ وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر میرے سر پر رکھتیں۔ میرے بالوں میں ان کی انگلیاں معلوم ہوتا تھا پھنس جاتی ہیں۔ اور وہ سونا نہیں چاہتیں۔ بہت دیر ہوگئی۔ جاؤ تم سو رہو..... اماں یوں ہی پلنگ پر لیٹی ہیں۔ ایک مہینہ، دو مہینہ، تین مہینہ، ایک سال، دو سال، سو سال، ہزار سال، موت کا فرشتہ آیا، بدتمیز، بیہودہ کہیں کا، چل نکل یہاں سے۔ بھاگ، ابھی بھاگ۔ ورنہ تیری دم کاٹ لوں گا۔ ڈانٹ پڑے گی پھر بڑے میاں کی! ہنستا ہے؟ کیوں کھڑا ہے سامنے دانت نکالے، تیرے فرشتے کی ایسی تیسی۔ تیرے..... فرشتے..... کی.....

ساری دنیا کی ایسی تیسی، میاں اکبر تمہاری ایسی تیسی، ذرا آپ کی قطع ملاحظہ فرمایئے۔ پھونک دوں تو اڑ جائیں۔ بڑے شاعر بنتے ہیں۔ شاعروں کی تعریف کیا ہو جاتی ہے کہ سمجھتے ہیں..... کیا سمجھتے ہیں۔ بے چارے سمجھیں گے کیا۔ بیوی جان کچھ سمجھنے بھی دیں۔ صبح سے شام تک شکایت۔ رونا دھونا۔ بچہ اپھٹا ہے۔ بچے کی ٹوپی کھو گئی۔ نئی خرید کے لے آؤ..... جیسے میری اپنی ٹوپی نئی ہے..... کہاں

کھو گئی ٹوپی۔ ؟ میں کیا جانوں کہاں کھو گئی۔ اس کے ساتھ کونے کونے میں ہتھوڑا بھاگتی پھرتی ہوں۔ مجھے کام کرنا ہوتا ہے، برتن دھونا، کپڑے سینا، سارے گھر کا کام میرے ذمے ہے۔ مجھے کسی کی طرح شرلینے کی فرصت نہیں۔ سُن لو خوب اچھی طرح سے مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ بھڑ کا چھتہ چھیڑ دیا۔ اب جان بچانی مشکل ہوئی۔ کیا قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ ماشاء اللہ چشم بد دور..... اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پاس پہننے کو ایک ٹھکانے کا کپڑا نہیں ہے۔ لڑکا تمہارا الگ ننگا گھومتا ہے۔ مگر تم ہو کہ معلوم ہوتا ہے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ جیسے کسی غریب کے بیوی بچے ہیں۔ ہائے اللہ میری قسمت پھوٹ گئی..... اب رونا شروع ہونے والا ہے۔ میاں اکبر بہتر یہی ہے کہ تم چپکے سے کھسک جاؤ۔ ہجرت کرنے سے ایک رسول کی جان بچی..... اے خدا آخر تو نے عورت کیوں پیدا کی۔ ؟ مجھ جیسا غریب، کمزور آدمی تیری اس امانت کا بار اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھا سکتا اور قیامت کے دن میں جانتا ہوں کیا ہوگا۔ یہی عورتیں وہاں بھی چیخ و پکار مچائیں گی۔ وہ غمزے کریں گی۔ وہ آنکھیں ماریں گی کہ الٰہی توبہ..... قیامت کا دن آخر کیسا ہوگا۔ ؟ سوا نیزے پر آفتاب، مئی جون کی گرمی اُس کے آگے ہیچ ہوگی..... گرمی کی تکلیف، توبہ، توبہ، اے توبہ، یہ مچھروں کے مارے ناک میں دم نیند حرام ہو گئی۔ پن پن۔ چٹ۔ وہ مارا، آخر یہ کمبخت کیوں ٹھیک کان کے پاس آکے بھنبھناتے ہیں۔ خدا کرے قیامت کے دن مچھر نہ ہوں۔ مگر گیا ٹھیک۔ کچھ ٹھیک نہیں۔ آخر مچھر اور کھٹمل اس دنیا ہی میں خدا نے کس مصلحت سے پیدا کئے۔ ؟ معلوم نہیں پیغمبروں کو مچھر اور کھٹمل کاٹتے ہیں یا نہیں، کچھ ٹھیک نہیں، کچھ ٹھیک نہیں..... آپ کا نام کیا ہے ؟ میرا کیا نام ہے۔ کچھ ٹھیک نہیں۔ واہ واہ واہ ! مصلحت خداوندی..... مجھے گھوڑا گاڑی پسند ہے۔ مگر قریب پہنچا نہیں ڈولتی پڑتی ہے، کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اور مجھے کیا پسند ہے ؟ میری جان ! مگر تم تو میری جان سے زیادہ عزیز ہو..... چلو ہٹو ! بس رہنے بھی دو۔ تمہاری میٹھی میٹھی باتوں کا مزا میں خوب چکھ چکی ہوں..... کیوں کیا ہوا کیا ؟..... ہوا کیا ! مجھ سے بے عزتی نہیں سہی جاتی۔ تم جانتے ہو میں بھر لونڈی کی طرح سے کام کرتی ہوں، بلکہ لونڈی سے بھی بدتر، جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں کسی خدمت گار کو ایک مہینہ تک ٹکتے نہیں دیکھا۔ مجھے سال بھر سے زیادہ ہو گیا۔ اور کبھی جو ذرا دم لینے کی فرصت ملی ہو۔ اکبر کی دلہن یہ کرو۔ اکبر کی دلہن وہ کرو..... ارے ارے کیا ہوا کیا۔ ؟ تم نے تو پھر رونا شروع کیا..... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہاں سے کہیں اور لے جاکے رکھو..... میں شریف زادی ہوں..... سب کچھ تو سہہ لیا اب مجھ سے گالی نہ برداشت ہوگی۔ گالی ! گالی ! معلوم نہیں کیا گالی دی۔ میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں، یا اللہ ! یا اللہ۔ اس کمبخت کا گلا اور میرا ہاتھ، اس کی آنکھیں نکل پڑیں، زبان باہر لٹکنے لگی۔ خس کم جہاں پاک..... خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو ! قصور ہوا، معاف کرو، اکبر ! میں نے تمہارے ساتھ احسان بھی کئے ہیں..... احسان تو ضرور کئے ہیں۔ احسانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر اب تمہارا وقت آگیا ہے۔ کیا سمجھ کر میری بیوی کو گالیاں دی تھیں ؟ بس ختم ! آخری دعا مانگ لو ! گلا گھونٹنے سے سر کاٹنا بہتر ہے۔ بالوں کو پکڑ کر کٹا ہوا سر اٹھایا، زبان ایک طرف کو نکلی پڑ رہی ہے۔ خون ٹپک رہا ہے۔ آنکھیں گھور رہی ہیں..... یا اللہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ؟ خون کا سمندر ! میں خون کے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ چاروں طرف سے لال لال گولے میری طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ وہ آیا ! وہ آیا ! ایک ! دو ! تین ! سب میرے سر پر آکر پھٹیں گے..... کہیں یہ دوزخ تو نہیں۔ ؟ مگر یہ تو گولے ہیں۔ آگ کے شعلے ہیں..... میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرے رونگٹے جل رہے ہیں۔ دوڑو ! ارے دوڑو ! خدا کے لئے دوڑو ! میں جلا جا رہا ہوں۔ میرے سر کے بال جلنے لگے۔ پانی ! پانی ! کوئی سنتا کیوں نہیں۔ ؟ خدا کے واسطے میرے سر پر پانی ڈالو ! کیا ! ان جلتے ہوئے انگاروں پر سے مجھے ننگے پیر چلنا پڑے گا۔ ؟ کیا۔ ؟ میری آنکھوں میں دہکتے ہوئے لوہے کی سلائیں ڈالی جائیں گی۔ ؟ کیا ؟ مجھے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا۔ ؟ کیا کیا کیا ؟ مجھے پیپ کھانا پڑے گی ؟ یہ شعلے کیوں میری طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں ؟ یہ شعلے ہیں یا نیزے ہیں۔ ؟ آگ کے نیزے ! زخم کی بھی تکلیف اور جلنے کی بھی..... یہ کس کے چیخنے کی آواز آتی ! میں تو سن چکا ہوں اس آواز کو آؤ آؤ آؤ..... اووو..... آواز دور ہوتی جاتی ہے۔ میرے لڑکے نے آخر کیا قصور کیا۔ ؟ میرے لڑکے کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ ؟ میرا لڑکا تو ابھی چار برس کا ہے۔ اسے تو معاف کر دینا چاہیئے۔ میں گنہگار ہوں ! میں خطا وار ہوں ! یہ کون آرہا ہے میرے سامنے سے ؟ اس کے پستان کو کاٹ رہے ہیں..... اے حضور ! آفتاب عرض ہے ! اے حضور بھول گئے ہم غریبوں کو۔ ؟ میں ہوں۔

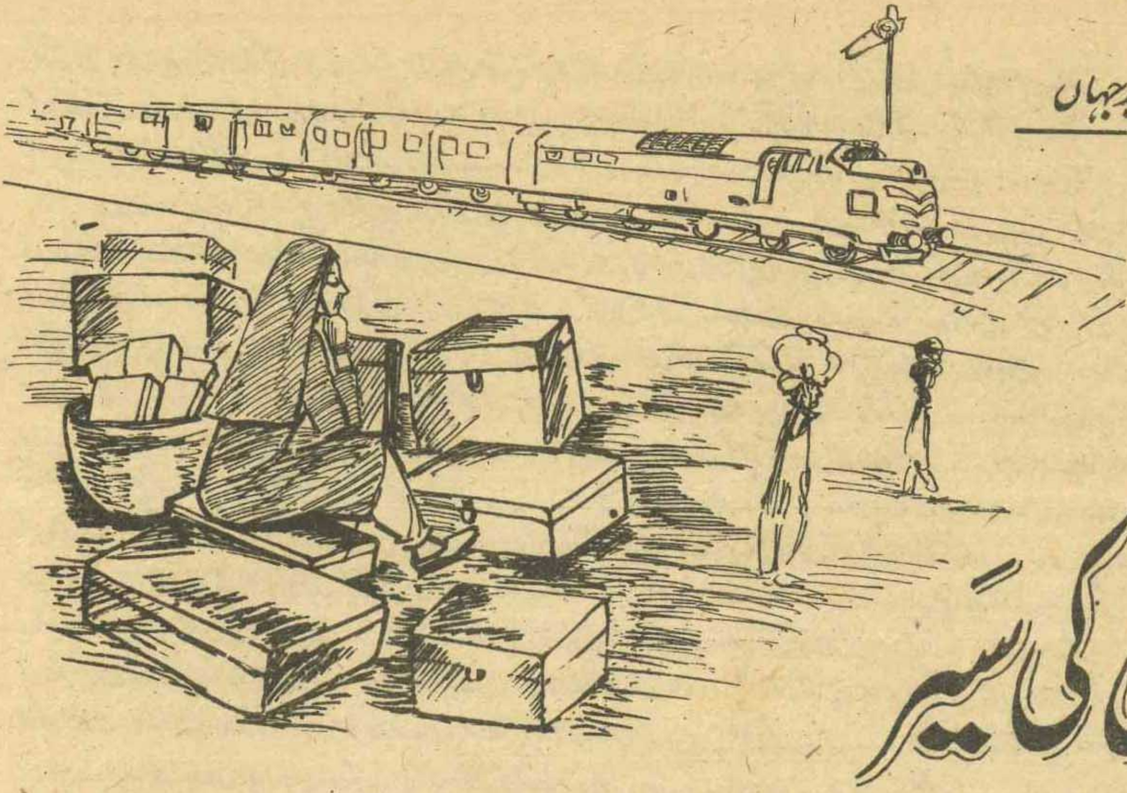
منی جان ! کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل۔ اے ہے آپ تو جیسے ڈرے جاتے ہیں حضور ! یہ سانپ آپ سے کچھ نہیں بولیں گے۔ ان کا بھی عجیب لطیفہ ہے۔ میں جب یہاں داخل ہوئی تو داروغہ صاحب نے کہا، بی منی جان ! سرکار کا حکم ہے پانچ بچھو تمہاری خدمت کے لئے حاضر کئے جائیں۔ میں حضور سہم گئی۔ بچپن سے مجھے بچھوؤں سے نفرت تھی۔ میں نے حضور بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر داروغہ صاحب نے کہا کہ سرکار کے حکم کی تعمیل اُن پر فرض ہے۔ تب میں نے کہا کہ اچھا آپ مجھے سرکار کے دربار میں پہنچا دیں۔ میں خود ان سے عرضداشت کروں گی۔ داروغہ صاحب بیچارے بڑے بھلے آدمی تھے، مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھایا، میرے گالوں پر ہاتھ پھیرے۔ آخر کار راضی ہو گئے۔ پہلے تو مجھے کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ داروغہ صاحب نے کہا کہ اس وقت سرکار کونسل کر رہے ہیں، جب اس سے فرصت ہوگی تب میری پیشی ہوگی۔ میں نے جو یہ سنا تو کوشش کی کہ جھانک کر میں بھی تو دیکھ لوں، مگر دروازے کے دربان، موٹے مسٹنڈے دیو، مجھے دھکا دے کر الگ کر دیا۔ خیر حضور ! آخر کار میری باری آئی۔ میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ سرکار کے دربار میں داخل ہوتے ساتھ ہی میں گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ میری اپنی زبان سے تو کچھ بولا نہ جاتا تھا، داروغہ صاحب نے میرا احوال بیان کیا۔ اتنے میں حکم ہوا ! کھڑی ہو ! میں حضور کھڑی ہو گئی، تو سرکار خود اٹھ کر میرے پاس تشریف لائے۔ بڑی سی سفید داڑھی، گورا چٹا رنگ، اور میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ایک بغل کے کمرے میں لے گئے۔ اور آپ کی دعا سے حضور میرے پاس بڑے بڑے رئیس آتے تھے ! خیر تو حضور بعد میں سرکار نے فرمایا کہ سزا تو تمہیں ضرور ملے گی، کیونکہ ان کا انصاف تو سب کے ساتھ برابر ہے، مگر بجائے بچھو کے مجھے دو ایسے سانپ ملے جو بس میرے پستان چاٹا کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے حضور تو اس میں تکلیف کچھ نہیں اور سزا بھی ہے..... مگر آپ تو مجھ سے ڈرے جاتے ہیں۔ اکبر صاحب ! اے حضور اکبر صاحب کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل.....

یا اللہ مجھے جہنم کی آگ سے بچا ! تو ارحم الراحمین ہے۔ میں تیرا ایک ناچیز گنہگار بندہ تیرے سامنے دست بدعا ہوں..... مگر کچھ بھی ہو ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں، مگر میں کروں تو کیا کروں ؟ بھوکا مروں ؟ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اس پر ایک کھوپڑی، کھٹ کھٹ کرتی سڑک پر چلی جا رہی ہے۔ اکبر صاحب ! آپ کے جسم کا گوشت کیا ہوا ؟ آپ کا چہرہ کدھر گیا ؟ جی میں بھوکا مر رہا ہوں، گوشت میں نے اپنا گدھوں کو کھلا دیا، چہرے کے طبلے بنوا کر بی منی جان کو تحفہ دے دیئے، کہئے کیا خوب سوجھی ! آپ کو رشک آتا ہو تو بسم اللہ میری پیروی کیجئے۔ میں کسی کی پیروی نہیں کرتا ! میں آزاد ہوں، ہوا کی طرح سے ! آزادی کی آجکل اچھی ہوا چلی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اور آپ ہیں کہ آزادی کے چکر میں ہیں۔ موت یا آزادی ! نہ مجھے موت پسند نہ آزادی۔ کوئی میرا پیٹ بھر دے۔

پن، پن پن۔ چٹ، ہٹ تیرے مچھر کی.....

ٹن ٹن ٹن..... ٹن ٹن.....

رشید جہاں



دِلّی کی سیر

"اچھی بہن ہمیں بھی تو آنے دو"۔ یہ آواز دالان میں سے آئی اور ساتھ ہی ایک لڑکی کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ملکہ بیگم ہی پہلی تھیں جو اپنی سب ملنے والیوں میں پہلے پہل ریل میں بیٹھی تھیں اور وہ بھی فریدآباد سے چل کر دہلی ایک روز کے لئے آئی تھیں، محلّہ والیاں تک اُن کی داستانِ سفر سننے کے لئے موجود تھیں۔ "اے ہے آنا ہے تو آؤ۔ میرا منہ تو بالکل تھک گیا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو سیکڑوں ہی بار تو سنا چکی ہوں۔ یہاں سے ریل میں بیٹھ کر دلّی پہنچی اور وہاں ان کے ملنے والے کوئی نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے۔ مجھے اسباب کے پاس چھوڑ یہ رفو چکر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی برقع میں لپٹی بیٹھی رہی۔ ایک تو کم بخت برقع، دوسرے مردوے۔ مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں اور اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکر پر چکر لگاتے ہیں۔ پان کھانے تک کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آوازے کسے، اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جاتے اور بھوک وہ غضب کی لگی ہوئی کہ خدا پناہ! دلّی کا اسٹیشن کیا ہے لو قلعہ بھی اتنا بڑا نہ ہوگا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی، اسٹیشن ہی اسٹیشن نظر آتا تھا اور ریل کی پٹڑیاں، انجن اور مال گاڑیاں، سب سے زیادہ ڈر مجھے ان کالے کالے مردوں سے لگا جو انجن میں رہتے ہیں۔

"انجن میں کون رہتے ہیں۔؟" کسی نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"کون رہتے ہیں؟ نہ معلوم بوا، کون! نیلے نیلے کپڑے پہنے، کوئی داڑھی والا، کوئی صفاچٹ، ایک ہاتھ سے پکڑ کر چلتے انجن میں لٹک جاتے ہیں۔ دیکھنے والوں کا دِل سن سن کرنے لگتا ہے۔ صاحب اور میم صاحب تو بوا دلّی اسٹیشن پر اتنے ہوتے ہیں کہ گنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گٹ پٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں۔ کمبختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا۔

"ذرا منہ بھی دکھا دو۔ میں نے فوراً......"

"تو تم نے کیا نہیں دکھایا۔" کسی نے چھیڑا۔

"اللہ اللہ کرو بوا۔ میں ان مووؤں کو منہ دکھانے گئی تھی۔ دِل بلیوں اچھلنے لگا۔" "تیور بدل کر" "سنتا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو۔" ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایسی مزیدار باتیں فریدآباد میں کم ہوتی تھیں اور ملکہ کی باتیں سننے تو عورتیں دور دور سے آتی تھیں۔

"ہاں بوا، سودے والے ایسے نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔ صاف صاف خاکی کپڑے اور کوئی سفید لیکن دھوتیاں کسی کسی کی میلی تھیں۔ ٹوکرے لئے پھرتے ہیں۔ پان، بیڑی سگریٹ، دہی بڑے، کھلونا ہے کھلونا اور مٹھائیاں چلتی ہوئی گاڑیوں میں بند کئے بھاگے پھرتے ہیں۔ ایک گاڑی آکر رکی، وہ شور و غل ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ اِدھر قلیوں کی چیخ و پکار، اُدھر سودے والے کان کھاتے جاتے ہیں مسافر ہیں کہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں اور میں بے چاری بیچ میں اسباب پر چڑھی ہوئی۔ ہزاروں ہی تو ٹھوکریں اور دھکے کھاتے ہوں گے۔ بھئی جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، گھبرا گھبرا کر پڑھ رہی تھی۔ خدا خدا کرکے ریل چلی تو مسافر اور قلیوں میں لڑائی شروع ہوئی۔

"ایک روپیہ لوں گا۔" "نہیں دو آنہ ملیں گے۔" ایک گھنٹہ جھگڑا ہوا۔ جب کہیں اسٹیشن خالی ہوا۔ خالی کیا ہوا اسٹیشن کے شہدے تو جمع ہی رہے۔ کوئی دو گھنٹہ کے بعد یہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دکھائی دیئے اور کس لاپرواہی سے کہتے ہیں۔

"بھوک لگی ہو تو کچھ پوریاں وُوریاں لا دوں، کھاؤ گی؟ میں تو اُدھر ہوٹل میں کھا آیا۔"

میں نے کہا کہ "خدا کے لئے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میں باز آئی اس موئی دلّی کی سیر سے، تمہارے ساتھ تو کوئی جنت میں بھی نہ جائے۔ اچھی سیر کرانے لائے تھے"۔ فریدآباد کی گاڑی تیار تھی۔ اس میں مجھے بٹھایا اور منہ پھلا لیا کہ "تمہاری مرضی، سیر نہیں کرتیں تو نہ کرو۔"

自力更生治理黄

ایک چینی کہانی

تاچیؑ کی کہانی

مصنف : ہین شالی

ترجمہ : انورعاقل

کوہ تائی ہنگ کے لامتناہی سلسلے میں ٹائیگر ہیڈ نامی پہاڑ کی آغوش میں تین سو باشندوں کا ایک گاؤں ہے۔ یہ مشہور تاچی تعلقہ کا تاچی بریگیڈ ہے جو صوبہ شانسی کی سی یانگ کاؤنٹی میں واقع ہے۔

۱۹۶۵ء کی بہار آمد میں، جب کہ پہاڑ ابھی تک ٹھنڈ کی لپیٹ میں تھے۔ کچھ جوشیلی خبروں نے اس چھوٹے سے گاؤں کو ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ تاچی کی رہنمائی کرنے والا پارٹی سیکرٹری چن یُنگ کوئی ابھی پیکنگ میں تیسری نیشنل کانگرس میں شرکت کرنے کے بعد واپس آیا ہے جہاں اس نے چیئرمین ماؤ کو دیکھا تھا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو سارا تاچی اس کے استقبال کے لیے امڈ پڑا۔ چن یُنگ کوئی نے دوستانہ انداز میں ان کی خیر و عافیت دریافت کی اور گاؤں کی صورت حال کے متعلق پوچھا۔ اس نے ان کو کانگرس اور اپنے چیئرمین ماؤ سے مصافحے کی بابت بتایا۔ جیسے ہی اس نے چیاچن تے زئی، ایک مثالی مزدور جس نے پہاڑی علاقے میں کام کیا تھا، کا سخت ہاتھ اپنی گرفت میں لیا تو اس نے دیہاتیوں کو بتایا کہ ——— چیئرمین ماؤ نے تاچی کے عوام اور چیاچن تے زئی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔ یہ سن کر کچھ لوگ خوشی سے رو پڑے۔

غریب بوڑھے چیاچن تے زئی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے ——— "ذرا تصور کرو کہ چیئرمین ماؤ کو ہماری ان پہاڑیوں کے ایک بوڑھے پتھر تراش کا بھی خیال ہے!" وہ چیخا ——— "کس نے اس کے بارے میں سوچا تھا!" بوڑھے آدمی نے جو تاچی میں ابتداء میں پارٹی میں شامل ہونے والوں میں سے ایک تھا۔ چن یُنگ کوئی کے مضبوط ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

سورج بلند ہوتا جا رہا تھا۔ کُہر و دھند میں سے جھانکتے ہوئے اس نے پھلوں کے درختوں، کھیتوں کی قطاروں کو جو تاچی کی سات گھاٹیوں، آٹھ چوٹیوں اور ایک ڈھلان پر تھے، سنہرا لباس پہنا دیا تھا اور گاؤں کے نئے گھروں کی کھپریلیں اتنی سرخ ہو رہی تھیں، جیسے سرخ جھنڈے لہرا رہے ہوں۔

اس چمکتے ہوئے سورج میں، چن یُنگ کوئی نے مسکراتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ ——— "چیئرمین ماؤ نے ان کی خود اعتمادی اور سخت مشقت کے انقلابی جذبے کو سراہا ہے ... اور" چن یُنگ کوئی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ——— "میں نے چیئرمین ماؤ سے وعدہ کیا ہے کہ تاچی کے لوگ اپنی اس کامیابی پر نہیں رکیں گے بلکہ مسلسل آگے بڑھتے رہیں گے۔"

چیئرمین ماؤ نے اپنی قوم کے کسانوں کو کہا ——— "زراعت میں تاچی سے سبق حاصل کرو!" اس چیز نے تاچی کے عوام کو آگے بڑھنے کے لیے دوگنی خود اعتمادی اور عزم دیا۔

آزادی سے قبل اس غریب گاؤں کی قابلِ زراعت اراضی "۳۰ لی" (ایک لی = ½ کیلومیٹر) سے زیادہ نہ تھی۔ تاچی کا آٹھ سو میو (ایک میو = ۱۶۴۲ء۰ ایکڑ) رقبہ سات گھاٹیوں، آٹھ چوٹیوں اور ایک ڈھلان میں بٹا ہوا تھا۔ خشک ہواؤں کی وجہ سے اونچائی پر مٹی لوہے کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ ماسوائے اچھے سالوں کے ایک میو میں ۴۰ ایکٹیز (CATTIES) سے زیادہ فصل نہ ہوتی تھی۔ زیادہ تر زمین ایک زمیندار اور تین امیر گھرانوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ۶۴ گھرانوں میں سے ۴۸ گھرانے غریب اور نچلے اوسط درجے کے تھے۔ ان میں سے ۳۰ ہاری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور تیرہ بھیک مانگنے جاتے تھے۔ تاچی کے لوگ بھوسی اور جنگلی پودوں پر گزارا کرتے۔

اگست ۱۹۴۵ء میں آزادی کا سرخ جھنڈا شی یانگ میں آ گیا۔ زرعی اصلاحات کی آمد آمد ہوئی۔ چن یانگ کوئی اور دوسروں نے پارٹی کی زیرِ کمان زمیندار کو نکال باہر کیا اور اس کی زمینوں کو ضبط کر لیا۔ محتاج و فقیر اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن تاچی کے عوام بہت زیادہ غریب تھے۔ تاچی کو زرعی اصلاحات کے بعد کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے؟ دو قطعی مختلف جواب ان کے پیشِ نظر تھے۔ ایک جواب یہ تھا کہ وہ متحد ہو جائیں اور سوشلسٹ اجتماعیت کی راہ کو اپنائیں۔ اس راہ کو چیئرمین ماؤ نے روشناس کرایا تھا ——— "زراعت کی اجتماعیت کے بغیر مضبوط و مستحکم سوشلزم قائم نہیں ہو سکتا۔" دوسرا حل تھا کہ ہر گھر انفرادی طور پر کاشت کاری کرے۔ یہ سرمایہ داری کی راہ تھی جس کی وکالت چھپا ہوا دشمن لیو شاؤ چی کر رہا تھا ——— "زراعت میں اجتماعیت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک صنعت و حرفت کو ترقی نہیں دی جاتی۔"

تاچی کے آزاد عوام چیئرمین ماؤ کی تعلیمات پر سختی سے جمے رہے۔ چن یانگ کوئی نے لیو شاؤ چی کے مغالطہ زدہ فلسفے کو اصولی طور پر ماننے سے انکار کر دیا ——— "جاپان کے خلاف جنگ میں" ... اس نے کہا ——— "ہم نے ہینڈ گرنیڈ پر بھروسہ کیا اور زمین دوز سرنگیں بنائیں تاکہ جاپانیوں کی جدید بندوقوں اور بھاری توپ خانے کو شکست دے سکیں۔ آزادی کی جنگ میں باجرہ اور بندوقوں پر بھروسہ کیا تاکہ چیانگ کائی شیک کے ۸۰ لاکھ دستوں کو جو امریکہ کی سرمایہ داری سے لیس تھے، باہر بھگا سکیں۔ اب ہم سوشلزم کی تعمیر کر رہے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ اجتماعی زراعت سے پہلے مشینوں کو بنائیں؟ اگر ہم نے سوشلزم کی تعمیر سے پہلے مشینوں کا انتظار کیا تو وہ ہمیں کام سے باز رکھے گا۔ اگر ہم اپنے بچوں اور آنے والی نسلوں کو غربت سے دور رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں متحد ہو جانا چاہیئے اور سوشلسٹ اجتماعیت کی راہ اختیار کرنی چاہیئے جس کی چیئرمین ماؤ نے نشاندہی کی ہے۔" اس نے تاچی کے غریب اور نچلے اوسط درجے کے کسانوں سے بات چیت کی، اور امدادِ باہمی اور شراکت سے کام شروع کیا۔

چند خوش حال گھرانوں نے سوچا کہ یہ محتاج فقیر ہم سے "بازی لے جائیں گے۔" چنانچہ انہوں نے ان کو مات دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک گروپ بنایا جس میں چند بہترین غریب کسانوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا اور "جفاکش اشتراکی ٹیم" (STOUT FELLOWS TEAM) بنائی۔ اگرچہ وہ اس کو امدادِ باہمی جماعت کہتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی کھیتی باڑی شروع کی۔ کیونکہ چن یُنگ کوئی ایک مضبوط ۳۰ سالہ جوان تھا اس لیے انہوں نے اسے

اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ لیکن چن ینگ کوئی حقیقی اشتراک کی راہ اپنانا چاہتا تھا۔ انہوں نے زیادہ تر غریب اور نچلے اوسط درجے کے کسانوں کو نکال باہر کیا جس سے چن ینگ کوئی نے اتفاق نہ کیا اور ٹیم سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس نے باقی ماندہ نو گھرانوں کو، جس میں سے چار آدمی پچاس سال سے زیادہ اور پانچ لڑکے، جن کی عمریں گیارہ سے سولہ سال تھیں، ایک حقیقی اشتراکی ٹیم میں منظم کیا۔ وہ اس کو بوڑھے اور جوانوں کی ٹیم کہتے تھے۔

اسی کی وجہ سے لوگوں کو بولنے کا موقع ملا۔ اوسط درجے کے خوشحال لوگ چپکے چپکے سے ان کا "مذاق" اڑاتے اور کہتے ——— "چن ینگ کوئی کی ٹیم کے بوڑھے قبروں میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور ان لڑکوں کو زراعت کی "الف، بے" کا بھی علم نہیں، ہم جلد ہی کوئی تماشا دیکھیں گے!" چند ایک نے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا ——— "اس بیچارے کو دیکھو! ایک اچھا کسان اپنی ہڈیوں کے گودے تک سے ان بوڑھے مرغوں اور چوزوں کے گروہ کے ساتھ سخت محنت کر رہا ہے۔ چن ینگ کوئی کا ضرور دماغ چل گیا ہے۔"

طنز و تشنیع کی اس بارش نے چن ینگ کوئی پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ بوڑھے اور جوانوں کی ٹیم کے پاس بار برداری کے جانور، اوزار اور افرادی قوت کی کمی تھی۔ لیکن وہ مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنا کام ایک عزم کے ساتھ کرتے رہے۔ سال کے آخر میں انہوں نے ایک اچھی فصل حاصل کی۔ جفاکش اشتراکی ٹیم سے بھی اچھی فصل! اس مسلّمہ حقیقت نے تاچئی کے لوگوں کو منظم ہونے کی طرف مائل کیا۔ ان سردیوں میں ۸۰ گھرانوں میں سے ۴۹ گھرانوں نے چن ینگ کوئی کے بوڑھے اور جوانوں کی ٹیم میں شمولیت اختیار کرلی۔

۱۹۵۲ء کے موسم بہار میں چن ینگ کوئی اور اس کے ساتھی اپنی امداد باہمی کی جماعت کو نیم سوشلسٹ کوآپریٹو میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ چن ینگ کوئی نے کاؤنٹی ٹاؤن کے ایک درجن سے زیادہ چکر لگائے تاکہ تاچئی کے غریب اور نچلے اوسط درجے کے کسانوں کی ضرورت کا خیال کرکے ایک کوآپریٹو شروع کیا جائے۔ لیکن کاؤنٹی کے منتظمین نے اس کی اجازت نہ دی۔ کیونکہ وہ شانسی صوبے میں لیو شاؤچی کے ایجنٹ تھے اور اس کے دباؤ میں تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب کوآپریٹو زراعت کی ہوا نے ملک کو لپیٹ میں لیا تو انہوں نے بادلِ نخواستہ اس کی اجازت دی۔

چن ینگ کوئی ٹیم ۴۹ گھرانوں کی ایک بڑی ٹیم تھی لیکن کاؤنٹی نے ۳۰ سے زیادہ گھرانوں کو کوآپریٹو میں رکھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ چن ینگ کوئی کو کوآپریٹو کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ اب چونکہ کوئی بھی ٹیم کا ممبر انفرادی زراعت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے ٹیم کے دو حصے کیے۔ ایک تیس گھرانوں کا اور دوسرا ۴۹ گھرانوں کا، جو خفیہ تھا۔ جب خزاں کی فصل کی بنائی کا وقت آیا تو کاؤنٹی کے عملے کو پتہ چل گیا انہوں نے انہیں خوب جھاڑا اور ڈانٹ پلائی۔ اس سال کوآپریٹو کی اوسطاً پیداوار ایک میو میں ۲۳۷ کیٹیز ہوئی۔ اس بات نے ان میں طاقت اور اجتماعیت پر یقین و اعتماد بخشا اور انہوں نے بنجر پہاڑوں کو قابلِ زراعت بنانے کا دس سالہ منصوبہ بنایا اور انہوں نے اپنی اجتماعی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ تاچئی کی غربت اور پسماندگی ختم کر دیں گے۔

اشتراک کوئی آسان کام نہ تھا۔ طبقاتی دشمنوں نے تاچئی میں دل گرفتہ خبریں اور افواہیں اڑانی شروع کر دیں ——— "آدمی، آدمیوں کا اندازہ (طرز) رکھتے ہیں" ——— "پانی، پانی کی خوبی رکھتا ہے" انہوں نے کہا ——— "مرغیاں، کتوں سے نہیں لڑتیں، پھر آدمی پانی سے کیسے ٹکرا سکتے ہیں۔ آج تک کوئی آدمی قدرت سے مقابلہ نہیں کر سکا ہے۔"

کچھ کوآپریٹو ممبر اپنے دل ہار بیٹھے ——— "ہمارے پہاڑ بہت بلند اور ہماری گھاٹیاں بہت گہری ہیں!" انہوں نے کہا ——— "ان کو تعمیر کرنے میں نجانے کتنے سال بیت جائیں۔"

لیکن چن ینگ کوئی پارٹی اور عوام کے مفاد میں چھریوں کے پہاڑ اور آگ کے سمندر میں سے گزر سکتا ہے۔ اس نے کہا ——— "اگر ہم اسے تین سال میں مکمل نہ کر سکے تو اس پر جُت جائیں گے اور پانچ نہیں تو دس سال میں ضرور ختم کر دیں گے۔ اگر ہماری زندگی اس کے لیے زیادہ نہیں ہے تو ہمارے بیٹے اور پوتے اس کو ختم کر دیں گے! چیئرمین ماؤ نے اس راہ کی نشاندہی کی ہے اور ہمیں ——— "بوڑھا آدمی، جس نے پہاڑوں کو ہٹا دیا!" کی کہانی بھی سنائی ہے ہمیں اس بوڑھے سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ پہاڑ مردہ ہیں اور ——— آدمی زندہ! ایک چوٹی کو، ہم ہموار کریں گے ایک چوٹی کم ہو جائے گی، ایک گھاٹی کو بھریں گے ایک گھاٹی کم ہو جائے گی۔ اگر ہم اس پر جُت گئے تو جلد یا بدیر اس کو ختم کر دیں گے۔"

کافی بحث مباحثے کے بعد کوآپریٹو کے ممبر اور دوسرے ساتھی اس بات پر متفق ہو گئے ——— "ہمارے پاس چار قابلِ بھروسہ چیزیں ہیں۔" انہوں نے کہا کہ "پہلا، ہم سب غریب اور نچلے اوسط درجے کے کسان ہیں۔ ہم غریبوں کی مثال چھپے ہوئے گنے کی طرح ہے چنانچہ ہمیں انقلاب لانا چاہیئے۔ ہمیں اپنا کام کرنے کے لیے اشارہ کافی ہے۔ دوسرا ہماری اجتماعیت، ہماری طاقت، سرمایہ اور زمین کوآپریٹو میں لگی ہوئی ہیں۔ ہمارے گاؤں میں آدمی، عورتیں، بوڑھے، جوان سب مل جل کر کام کر رہے ہیں۔"

"تیسرا، ہم ایک اچھی پارٹی برانچ اور محنتی عملہ رکھتے ہیں اگر وہ ہماری مدد کریں تو ہم اپنی افرادی قوت کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کر سکیں گے۔ چوتھا، ہمارے پاس ہاتھ اور بیلچے ہیں، غنائی تمثیل یا اوپیرا گلوکاروں پر، زمین اپنے مرکز پر اور کام آدمیوں پر انحصار کرتا ہے۔ اگر ہم نے انقلابی یلغار کی تو پہاڑ جلد ہی اپنا سر جھکا دیں گے، اور دریا خود بخود راستہ چھوڑ دیں گے۔"

تاچئی کے پرعزم لوگوں نے بنجر پہاڑی علاقے پر اپنی جنگ شروع کی۔

چن ینگ کوئی نے کہا ——— "تاچئی میں کوئی سست موسم سرما نہیں ہوگا!" اس موسم سرما میں دیہاتیوں نے اپنی تمام تر قوت لگا دی۔ ٹھنڈ کا مردانہ وار

مقابلہ کرتے ہوئے برف کو اپنے قدموں میں روندتے ہوئے اور چاند تاروں کی روشنی میں کام کرتے ہوئے انہوں نے پہاڑوں کو برابر اور گھاٹیوں کو بھرنے کی جنگ شروع کی۔ انہوں نے پہاڑوں سے پتھر نکالے، گھاٹیوں پر باندھ، خالی جگہوں کو بھرا اور گھاٹیوں کو قابلِ زراعت اراضی میں تبدیل کر دیا۔ پہلے سال انہوں نے چوبیس بند باندھے اور وائٹ کیمل گھاٹی کو بھرا جو ایک لی" سے زیادہ لمبی اور تیس فیٹ سے زیادہ چوڑی تھی۔ اس کامیابی کے بعد انہوں نے بقیہ پانچ گھاٹیوں کو بھرنے کا کام شروع کیا۔

۱۹۵۵ء کے آخر میں "وولف لیئر" کی گھاٹی کو پُر کرنے کی جنگ شروع ہوئی۔ "وولف لیئر" تاچئی کی سب سے بڑی گھاٹی تھی جو تین لی سے زیادہ لمبی اور تیس سے چالیس فیٹ چوڑی اور ایک سَو سے دو سو میٹر تک گہری تھی۔ گرمی کی بارشوں میں اس میں پانی اس طرح گرجتا، برستا، گِرتا جیسے گھوڑوں کے باڑے میں بھگدڑ مچی ہو۔

کیا اس مہیب گھاٹی کو بھرنا ممکن تھا؟ چند کوآپریٹو ممبر اس بارے میں شک و شبہ رکھتے تھے۔ لیکن چن یُنگ کوئی نے حسبِ معمول اپنے آگے بڑھنے کے عزم کو دہرایا ——— "ہمیں وولف لیئر کو ضرور سَر نگوں کرنا چاہیئے تاکہ زیادہ سے زیادہ غلّہ اگا سکیں۔" اس نے کہا ——— "ہم اسے زیر کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ایک رہیں۔"

موسلا دھار بارشوں اور تیز آندھیوں کی وجہ سے وہاں کوئی درخت نہیں رہا۔ تاچئی کے عوام نے وولف لیئر کو بھرنے کے لیے دو سال تک مسلسل جدوجہد کی لیکن ہر سال تیز و تند سیلابوں نے ان کی جدوجہد کو ناکام بنا دیا۔ طبقاتی دشمنوں نے اس ناکامی پر خوب خوشیاں منائیں۔ چند کوآپریٹو ممبر اپنے دل ہار بیٹھے تھے۔ ——— "چن یُنگ کوئی نے ہمیں اچھا بیوقوف بنایا ہے۔" چند خوشحال کسان بڑبڑائے ——— وولف لیئر کو کار آمد بنانے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ہم نے اپنے دو کمر توڑ موسمِ سرما اس پر ضائع کیے ہیں۔ اس سال تم ہمیں دوبارہ نہیں حاصل کر سکتے۔" (یا اس سال تم ہم سے یہ کام نہیں کروا سکتے) ایک دو عہدیداروں نے بھی پس و پیش کرنا شروع کر دیا۔

لیکن چن یُنگ کوئی نے لوہے کے آدمی کی طرح اپنا حوصلہ نہ ہارا۔ وہ کئی گھنٹے "وولف لیئر" کی پہاڑیوں پر دو زانو بیٹھ کر اس مسئلے پر غور کرتا اور اپنا پائپ پیتا جاتا۔ اس نے زمیندار اور امیر کسانوں کو اس ناکامی پر خوش ہوتے ہوئے تصوّر کیا اور قسم کھائی ——— "غریب اور نچلے درمیانی طبقے کے کسان کسی زمیندار یا امیر کسان سے شکست نہیں کھائیں گے، ہم وولف لیئر کو ضرور زیر کریں گے۔"

اس نے پارٹی ممبروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ ان کے مورال کو بڑھانے کے لیے اس نے انہیں "بیوقوف بوڑھا جس نے پہاڑوں کو ہٹا دیا"، پڑھ کر سنائی "ہم کو چیئرمین ماؤ کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیئے" اس نے کہا ——— "اور ہمیں بیوقوف بوڑھا، جس نے پہاڑوں کو ہٹا دیا کی جرأت و بہادری سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔"

پارٹی ممبروں نے چن یُنگ کوئی سے اتفاق کیا ——— "وولف لیئر سے کوئی پسپائی اختیار نہ کی جائے" انہوں نے زور دیا ——— "ہم غریب اور نچلے درمیانی طبقے کے کسان انقلابی جدوجہد و عزم میں ناکام ہو کر طبقاتی دشمنوں کو خوش نہیں کریں گے!"

چن یُنگ کوئی اپنے چند پرانے ساتھیوں، جو آزادی سے قبل اس کے ساتھ ہاری کی حیثیت سے کام کرتے تھے، کے ساتھ "وولف لیئر" گیا۔ انہوں نے پشتوں کا احتیاط سے معائنہ کیا اور اس میں خرابی کا پتہ چلا لیا۔ پشتوں کے درمیان ڈھلان بہت زیادہ تھی، اگر وہ اس کو کم کر دیں اور پشتوں کے نیچے نالیاں کھود دیں تو دریا کی طغیانی کو کم کیا جا سکتا ہے اور پھر پشتوں کو بہا لے جانا مشکل ہوگا۔

چن یُنگ کوئی اب بھی پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ وہ دن کے ہر لمحے میں اور رات کو اپنے کانگ کے بستر پر لیٹا ہوا اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا اسے ایک اور راہ سجھائی دی۔ وہ جوش میں اٹھا اور اپنے پرانے ساتھیوں کو بتانے کے لیے تیزی سے باہر چلا گیا۔

چنانچہ "وولف لیئر" کے خلاف تیسری جنگ کا آغاز ہوا۔ چن یُنگ کوئی جو پشتے بنانے میں مہارت رکھتا تھا، اپنے قابلِ اعتماد کامریڈوں کے ساتھ اس پر یلغار کر دی ہر روز سورج کی پہلی کرن کے ساتھ بوڑھا راج (سنگ تراش) چیاچن تے نئی ایک ہتھوڑا اور برما اپنی کمر پر رکھے ہوئے سب سے پہلے اپنا کام شروع کر دیتا۔ "خود انحصاری اور سخت مشقت" ان کا نعرہ تھا۔ ۲۷ دن میں برف پر کام کرتے ہوئے انہوں نے وولف لیئر، قدرت کا سب سے زیادہ ثابت قدم قلعہ جو تاچئی کے عوام کی راہ میں پڑا تھا، ختم کر دیا۔

تاچئی کے بے خوف انقلابی عوام نے دس سال ۱۹۵۳ سے ۱۹۶۲ء تک سخت محنت کی۔ اس تمام عرصہ میں انہوں نے ریاست سے کچھ نہ مانگا۔ اپنے ہاتھوں اور کدالوں سے، اپنے کندھوں پر کھمبے لے جاتے ہوئے انہوں نے اپنے بریگیڈ کی سات گھاٹیوں، آٹھ چوٹیوں اور ایک ڈھلان کو قابلِ کاشت بنایا۔ انہوں نے ۱۳۰,۰۰۰ مکعب میٹر پتھر استعمال کیے۔ اور ۱۸۰ مکعب میٹر پتھر کے بند باندھے جن کی کل لمبائی "۱۵ لی" ہے۔ ۲۰۰ میو گھاٹیوں کی زمین کو اچھے قطعوں میں تبدیل کر دیا جہاں فصلیں بغیر کسی سیلاب یا خشک سالی کے ہو سکتی ہیں، چوٹیوں کی ۶۰۰ میو زمین کو قابلِ کاشت بنایا۔ آخر کار انہوں نے ایک میو زمین میں اوسطاً ۲۷۷ کیٹیز غلّہ حاصل کیا۔

۱۹۶۳ء کے موسم گرما میں، تاچئی کی فصلیں گھنی اور رسدار ہو چکی تھیں۔ تعلقہ کے ممبر اچھی فصل کے نظارے سے خوش ہوتے۔ جہاں تک پیداوار کا تعلق تھا۔ تاچئی نے زرد دریا (ELLOW RIVER) کے ساتھ اوسطاً پیداوار میں سبقت لی ہوئی تھی۔ اب وہ اسے ایک میو میں ۸۰۰ کیٹیز تک بڑھانا چاہتے تھے۔

تب ایک ناقابلِ قیاس واقعہ ہوا۔ صدی کی بدترین بارش اور سیلاب اپنے ساتھ خوفناک کھنڈرات لے کر آئے۔

اگست ۲ سے ۸ تاریخ تک زوروں کی بارش ہوتی رہی۔ اس ایک ہفتے میں اولڈ مین ہیون" (خدا) نے تحصیل کو ۱۹۶۲ء کی برسات کے برابر پانی برسا کر غرق کر دیا۔ تاچیئی کے لوگوں کو اب تک ایسی سخت مصیبت سے پالا نہیں پڑا تھا۔ چن ینگ کوئی اس ہفتے کاؤنٹی میں ایک کانفرنس میں شریک تھا۔ جب وہ خبروں کے لیے ٹیلی فون کرنے ہی والا تھا کہ بریگیڈ لیڈر چیا چھنگ جانگ نے تاچیئی سے ایک فوری کال کی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں چن ینگ کوئی کو بتایا ——— "میرے پاس پریشان کن خبریں ہیں ینگ کوئی! زمین کے پورے قطعے کے قطعے بہہ گئے ہیں۔ تیس سے زیادہ گھر دھنس گئے ہیں۔"

"کوئی زخمی ہوا؟" چن ینگ کوئی نے پوچھا۔

"نہیں! ہم ہر ایک کو وقت پر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"بہت اچھے، بوڑھے چیا! تمام پارٹی اور یوتھ لیگ ممبروں، ملیشیا اور کسانوں کو حفاظتی اور سیلاب سے تدارک کی ٹیموں میں منظم کرو۔ شہیدوں اور سپاہیوں کے خاندانوں کے ساتھ پرانے غریب طبقے کے لوگوں کی نگہبانی کرو۔"

دوپہر کو طوفان نے ٹیلیفون لائنیں توڑ دیں۔ چن ینگ کوئی کے لیے واپس جانا ناگزیر تھا۔ اس نے چڑھے ہوئے شانسی دریا کو عبور کیا۔ اور کیچڑ سے لتھڑے ہوئے برق رفتاری سے تاچیئی کی طرف چل پڑا۔ جب وہ قریب پہنچا تو سڑک بہت خراب ہو گئی۔ چن ینگ کوئی کے دل میں بے چینی و اضطراب ہے، "پچ، پچ" کرتا آگے بڑھتا رہا۔ تاچائے کی پہلی جھلک دیکھ کر وہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پہاڑیوں میں کچھ غار گھر دب گئے تھے اور بڑے بڑے پتھروں نے ان کا راستہ بند کر دیا تھا۔ کچھ کا نام و نشان تک مٹ گیا تھا۔ گھاٹیوں کے پشتے تہس نہس ہو گئے تھے۔ مٹی اور فصلیں بہہ گئی تھیں اور نظر کے سامنے ننگی گھاٹیاں تھیں۔ مکئی اور جوار کے پودے زمین سے الگ ہو گئے تھے یا کیچڑ کے اندر دب گئے تھے۔ سیبوں کے درخت اکھڑ چکے تھے۔ چن ینگ کوئی کے دل میں ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگوں کو سکتہ ہو گیا، وہ ایک قدم بھی نہ چل سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے تھوڑی دیر رکنا پڑا۔

"ہمارے گھر کھنڈر ہو چکے ہیں..... ہماری زمین بہہ چکی ہے.....،" اس نے سوچا ——— کیا تباہی و بربادی ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ تعلقہ کے ممبر بھی میری طرح شکستہ دل ہوں گے ——— مجھے کیا کرنا چاہیئے ——— ؟" اسی لمحے اسے چیئرمین ماؤ کی تعلیمات یاد آئیں ——— "مشکل اوقات میں ہمیں اپنی کامیابیوں کو نہیں بھولنا چاہیئے، روشن پہلو پر نظر رکھنی چاہیئے اور ——— حوصلہ و ہمت کو بالاتر رکھنا چاہیئے۔" سچ ہے ایک کمیونسٹ کو کبھی مشکلات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے دیہاتیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ضرور کوئی راہ تلاش کرنی چاہیئے ——— !

چھن ینگ کوئی جیسے ہی گاؤں پہنچا بریگیڈ لیڈر اور دوسرے لوگ اس کی طرف لپکے۔ چیا چھنگ جانگ نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا ——— "ینگ کوئی ——— !" وہ چلایا ——— "ہم بڑی بے چینی سے تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے!"

چیا کی آنکھیں نیند کی کمی کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں، اس کا وزن کم ہو گیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ چھن ینگ کوئی نے ان دنوں کی مشکلات کو سمجھا۔

"لوگوں کے بارے میں کیا خبر ہے ——— ؟" اس نے پوچھا

"تمام بحفاظت ہیں!" چیا نے جواب دیا۔

"اور..... مویشی ——— ؟"

"وہ بھی بحفاظت ہیں!"

"اناج..... ؟"

"ہم نے اسے پانی سے نکال لیا ——— لیکن کچھ خراب بھی ہو گیا!"

چھن ینگ کوئی نے اطمینان کا سانس لیا اور چیا کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا ——— "یہ ہماری بڑی کامیابی ہے کہ ہمارے آدمی، مویشی اور اناج محفوظ ہے!" اس نے اعلان کیا!

چیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ خوفناک سانحہ ہے، ینگ کوئی!"

"کوئی بات نہیں!" حوصلہ افزا جواب تھا ——— "یہ ہم پر منحصر ہے کہ اس بھاری بوجھ کو کیسے اٹھائیں۔ ہمیں تعلقے کے ممبروں کے پاس جانا چاہیئے اور ان کا حوصلہ بڑھانا چاہیئے..... وہ کہاں ہیں؟"

"غار گھروں میں رہنا خطرے سے خالی نہیں، وہ سب کلب میں ہیں!"

"چلو ان سے چل کر ملیں!"

کلب میں چھن ینگ کوئی کے گرد تعلقے کے ممبروں نے بے قراری سے گھیرا ڈال دیا۔ وہ اس کو بہت کچھ بتانا چاہتے تھے لیکن ہر ایک کا دم جوشِ جذبات سے رکنے لگا اور ان کے لیے بولنا مشکل ہو گیا۔ چند عورتوں نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ ان کے رنج و مصیبت نے چھن ینگ کوئی کے دل کو چیر دیا۔ لیکن اسے زبردستی

مسکرا پڑا۔

ایک سفید بالوں والے بوڑھے دیہاتی نے حیرت سے کہا ——— "تاچائے کے عوام کو مصیبت نے ادھ موا کر دیا، ینگ کوئی، پھر تم کیسے مسکرا سکتے ہو ——— ؟"

ایک سیکنڈ کے بعد چھن ینگ کوئی نے سنجیدگی سے جواب دیا ——— "یہ ایک آفت ہے، لیکن میں آپ سب کو مبارک باد دیتا ہوں!"

انہیں اپنے کانوں پر بڑی مشکل سے یقین آیا

"ہم کو مبارک باد" ——— بوڑھا دیہاتی بڑبڑایا ——— "دنیا میں کیا رہ گیا ہے؟ ہم سب صرف رونے دھونے سے الگ رہ سکتے ہیں۔"

"نہیں، میرا مطلب واضح ہے، مبارک باد!" چھن ینگ کوئی مسکرایا ——— "کوئی جان ضائع نہیں ہوئی۔ یہ بہتر ہے۔ کہاوت ہے کہ ہمیں کسی ایندھن کی ضرورت نہیں بلکہ پہاڑ موجود ہوں۔ اس سے بھی زیادہ اہم: ہم میں کمیونسٹ پارٹی اور چیئرمین ماؤ کی قیادت، اشتراکی معیشت کی برتری اور جان توڑ مسلسل جدوجہد موجود ہے۔ ان تین ہتھیاروں سے . . . . !"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات ختم کرتا، ایک بوڑھے کسان نے اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر ان الفاظ کا اضافہ کیا ——— "ان تین ہتھیاروں کے ساتھ ہم "اولڈ مین ہیون" سے لڑیں گے! ہم ان تین ہتھیاروں پر بھروسہ کرتے ہیں، کیا ہم "ڈرلف لیڈر" کے خلاف تین جنگوں میں ان پر بھروسہ نہیں کیا تھا؟"

"تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ینگ کوئی؟" ممبروں نے پوچھا۔

اس نے مسرت و خوشی سے جواب دیا ——— "جب تک موسم معمول پر نہیں آجاتا ہمارا کام ہے خوب کھائیں اور سوئیں، پھر ہم کام کریں گے، پیداوار بڑھائیں گے اور اس مصیبت پر قابو پالیں گے!"

جب وہ تعلقے کے ممبروں کو مطمئن کر چکا تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ اس نے کلب سے جاتے ہوئے ایک لالٹین لی اور گاؤں کا چکر لگایا۔

موسلا دھار بارش رک چکی تھی لیکن مطلع ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔ چھن ینگ کوئی اور دوسرے آفیسرز نے عجلت میں ایک میٹنگ طلب کی اور دیہاتیوں کے مکانوں کے مسائل پر بات چیت کی۔ یہ معاملہ طے ہونے کے بعد وہ کھیتوں کا معائنہ کرنے گیا۔ سیلاب کے پانی نے جنگلی جانوروں کی طرح تباہی مچائی تھی ——— نقصانات دل ہلا دینے والے تھے۔ کیا تاچائے کے عوام اس شدید چوٹ سے صحت یاب ہو سکتے تھے؟ انہیں اس پر قابو پانے کے لیے کس چیز پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟ چھن ینگ کوئی نے ان سوالوں پر غور و فکر کرنے کے لیے میٹنگ طلب کی۔ تعلقے کے کچھ ممبروں نے کہا کہ تاچائے نے، ریاست کو کوآپریٹو بننے کے بعد تک زیادہ غلّہ فروخت کر کے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے، اب ہم مشکل سے دوچار ہیں اس لیے ریاست کو ہماری مدد کرنی چاہیئے۔ چند آفیسرز کا خیال تھا کہ قرضہ ان کے لئے باقی مسائل کو کم کر کے ان کے کام میں مدد دے گا۔ اس کے باوجود ممبروں کی اکثریت کسی امداد کی درخواست کی مخالف تھی۔

جب زندگی معمول پر آئی تو انہوں نے کھیتوں کو دوبارہ صحیح کرنا، کھاد جمع کرنا اور ربیع کی فصل بونے کی تیاری شروع کر دی تاکہ اگلے سال ایک اچھی فصل کی ضمانت دی جا سکے۔

(OLD MAN HEAVEN) "خدا" برابر مشکلات پیدا کر رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تاچائے کے عوام کی ہمت و استقلال کو آزمانا چاہتا ہے۔ تاچائے کو مزید چھ تباہیوں سے واسطہ پڑا۔ دو ژالہ باری، ایک طوفان باد و باراں، ایک جان گسل پالا، بہار میں طغیانی اور گرمیوں میں خشک سالی! لیکن دیہاتیوں نے، لوہے کے آدمیوں کی طرح اپنے آپ پر بھروسہ کیا اور پھر ایک کے بعد دوسری فتح حاصل کرتے چلے گئے۔

تاچی کے کسانوں کا خیال تھا کہ کھیتوں کو دوبارہ زیر کاشت لانے میں تین سے پانچ سال تک کا عرصہ درکار ہے اور مکانوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دس سال لگیں گے۔ لیکن جب انہوں ایک دل و جان ہو کر کام کرنا شروع کیا تو انہوں نے اپنے پانچ سالہ منصوبے کو مہینے میں ختم کر دیا۔ ان کے تجربے نے انکے دلوں میں خود الحضاری کی اہمیت کو جگہ دی جسے چیئرمین ماؤ نے پیش کیا تھا۔ اگر انہوں نے چیئرمین ماؤ کی تعلیمات اپنائیں تو وہ کبھی گمراہ نہیں ہوں گے۔ چنانچہ تعلقے کے ممبر اور آفیسرز چاہتے تھے کہ چیئرمین ماؤ کے کام کا اچھی طرح مطالعہ کریں اور اسے آزمائیں تاکہ انقلاب رکے بغیر آگے ہی بڑھتا رہے۔

۱۹۶۴ء میں چیئرمین ماؤ نے اپنی قوم سے کہا ——— "زراعت میں تاچی سے سبق حاصل کرو!"

تاچی نے سرخ جھنڈے تلے دیہات میں سرمایہ داری کی تجدید کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ یہ شانسی صوبے میں لیوشاؤچی اور اس کے ایجنٹوں پر کاری ضرب تھی۔ تاچی ان کی راہ میں کانٹا ثابت ہو رہا تھا۔ انہوں نے دس سال تک اپنی مجرمانہ حرکتوں سے تاچی کے سرخ پرچم کو نیچا دکھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۹۶۴ء کے موسم سرما میں، شانسی میں لیوشاؤچی اور اس کے ایجنٹوں نے سوشلسٹ تعلیمی تحریک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منظم سازشوں کا منصوبہ بنایا۔ ایک ورک ٹیم جو اسپیشل صوبہ جاتی۔ انتظامیہ اور کاؤنٹی پارٹی کمیٹیوں پر مشتمل تھی اور جس صوبے میں سرمایہ داروں کے ایجنٹ کنٹرول کر رہے تھے، تاچی گئی۔ چیئرمین ماؤ کی سوشلسٹ تعلیمی تحریک کی صحیح راہ اور پالیسیوں کو اپنانے کی بجائے انہوں نے لیوشاؤچی کی سرمایہ دارانہ راہ کو بڑے شوق

سے اپنایا۔ تاچیئی میں اپنے قیام کے دوران ورک ٹیم نے قصداً مقامی آفیسروں کے خلاف لوگوں میں بغض وکینہ کا بیج بویا۔ زمیندار، امیر کسانوں اور دوسرے بدنام عناصر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی عداوت اور بے اطمینانی کا اظہار کیا اور "مال" کی سپلائی کے لیے ہر وقت تیار رہنے لگے۔ غریب اور نچلے اوسط درجے کے کسانوں اور مقامی آفیسرز جن کی رہنمائی چھن ینگ کوئی کر رہا تھا۔ ان کے حملوں کا خاص ہدف تھے۔

ورک ٹیم کے ممبروں نے تاچیئی کو بے عزت اور زیر کرنے کی "تدبیروں" میں اپنا سر کھپانا شروع کر دیا۔ ان کے بیان کے مطابق تاچیئی جیسی ایک بنجر پہاڑی تحصیل نے زیادہ زمین رکھتے ہوئے کم زمین ظاہر کی ہے اور صرف اسی لیے وہ اتنا غلّہ پیدا کر سکی ہے۔ انہوں نے اس "پوشیدہ زمین" کو معلوم کرنے میں پچاس سے زیادہ دن سروے کرنے میں گزارے۔ آخر کار ثابت یہ ہوا کہ تاچیئی کے پاس چند ایک میو زمین کم ہے ——— زیادہ نہیں ——— جیسا کہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے۔

اب انہوں نے دعویٰ کیا کہ مجموعی پیداوار کا ریکارڈ غلط ہے۔ انہوں نے ریکارڈ کی چھان بین کی، ہر ایک گھر میں ذخیرے رکھے ہوئے غلّہ کا وزن کیا! نتیجہ۔ اندراج کیے ہوئے غلّے سے ایک کیٹس بھی زائد نہ تھی۔ ورک ٹیم کی تمام سازشیں ناکام ہوگئیں اور تاچیئی کے عوام فتحیاب ہوئے۔

ثقافتی انقلاب کے دوران، چھن ینگ کوئی کی قیادت میں غریب اور نچلے اوسط درجے کے کسان، دوسرے انقلابی دستوں اور شانسی کے صوبائی آفیسروں، ہسیانگ، کاؤنٹی اور شانسی کی صوبائی کمیٹی میں طاقتور سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کے خلاف متحد ہو گئے تاکہ ان کی عملداری کو ختم کیا جا سکے۔ انہوں نے ان سے اقتدار چھین لیا۔ چیئرمین ماؤ کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے جدوجہد کے مقاصد کو سختی سے تھامے رکھا۔ اور انقلاب کو صحیح راہ پر لانے اور پیداوار کو بڑھانے میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔

چھن ینگ کوئی اور تاچیئی کے ہیرو عوام آج بھی پہلے کی طرح منکسر مزاج اور زیرک ہیں۔ وہ چیئرمین ماؤ کی مزدوروں کی انقلابی پالیسی کو اپنائے ہوئے سوشلزم کے وسیع راہ پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

آئندہ ہفتے



عظیم انقلابی حسن ناصر شہید کی یاد میں

اشاعتِ خاص پیش کر رہا ہے

لکھنے والے

منہاج برنا۔ فارغ بخاری
خالد علیگ اور حسن ناصر کے
قریبی ساتھی محمد علی کی یادداشتیں

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں

ہفت روزہ الفتح کراچی۔ فون :- ۴۱۲۲۷۴



قوم موجودہ دور میں ایک نہایت ہی سنگین بحران سے دوچار ہے۔ اور اس سنگین بحران سے مقابلہ کے لئے حکومت وقت کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ انہی مختلف النوع مسائل میں سے ایک مسئلہ تعلیم کا ہے۔ نظامِ تعلیم کی تبدیلی اور ملک سے ناخواندگی کا جلد از جلد دور کرنا۔

ہمارے نظامِ تعلیم کی کیفیت اس بوسیدہ عمارت کی سی ہے جس کی بنیادیں تک ہل چکی ہوں۔ ہم سب کا یہ مشاہدہ ہے کہ نظامِ تعلیم موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اور اس میں تبدیلی ایک لازمی امر ہے۔ یہ تبدیلی کس نوعیت کی ہونی چاہیئے۔ اس کے بارے میں مختلف قسم کی آراء کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ اسلامی نظامِ تعلیم کا نفاذ ہونا چاہیئے جو نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ ہو یا یہ کہ نظامِ تعلیم کو آزاد ہونا چاہیئے۔

نظامِ تعلیم کسی خاص فلسفۂ زندگی کی ترجمانی کرتا ہو تو اس کی سودمندی اور اثر پذیری سے انکار نہیں ہوسکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی تک اس قسم کی کسی بھی روایت کی بنیاد نہیں ڈالی گئی۔ لیکن اب اس اٹل حقیقت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اپنے نظامِ تعلیم کو مرتب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ملک میں آجکل یہ مطالبہ زوروں پر ہے کہ نظامِ تعلیم اسلامی ہو اور نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ۔ بے شک ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اور ہماری موجودہ حکومت اس مطالبہ کو پورا کرنے کی غرض سے مختلف اقدام کر رہی ہے۔ لیکن میں موجودہ دور میں دی جانے والی تعلیم بالخصوص دینی تعلیم کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہونگا۔

موجودہ دینی تعلیم

ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں بھی دینی تعلیم شامل ہے۔ اور کالج کی سطح پر بی ایس سی سال اوّل کے طلباء کے لئے لازمی قرار دی گئی ہے۔ میں یہاں اس سے تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔ بہت ممکن ہے کہ قارئین کو میری یہ شکایت گراں گزرے لیکن میں اس مسئلے پر غور کرنے کی دعوت دوں گا۔

بی ایس سی علم کا وہ درجہ ہے جہاں پہنچ کر ایک طالب علم عمر اور علم کے اعتبار سے اس قابل ہوجاتا ہے کہ نصاب میں شامل مضامین کے علاوہ بھی وہ دوسرے مضامین اور مشاغل میں دلچسپی لے اور مضامین اور مشاغل کے بارے میں اپنی ایک مخصوص ذاتی رائے رکھے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ اس کی دلچسپیوں کا دائرہ ایک پڑھے لکھے انسان کی حیثیت سے کافی وسیع ہوجاتا ہے ہمارے نصاب میں چند دینی کتب شامل ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب جو کراچی یونیورسٹی سے منظور شدہ ہے۔ اس کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ کتاب کا نام -- "دین مبین" ہے۔ کتاب کے مصنف جناب مولانا عبدالسلام صدیقی قادری صاحب ایم اے (عثمانیہ) ریسرچ اسکالر ہیں۔ اس کتاب کا پہلا باب تقریباً تمام طلباء کے لئے اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ اس باب کا موضوع ہے "حیاتِ انسانی کے بنیادی مسائل اور ان کا حل" میں اس کتاب سے چند اقتباسات پیش کروں گا۔ جہاں اختلاف کا پہلو نکلتا ہے، اس باب میں صفحہ ۱۹ پر مصنف رقمطراز ہیں کہ۔

"یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سائنس کی وجہ سے ہماری سادہ زندگی میں بڑی سہولت پیدا ہوئی ہے۔ اور سائنس انسان کی مادی ضروریات کو پورا کرنے میں لگاتار مصروف ہے۔ سائنس کا دارومدار تجربہ اور مشاہدہ پر ہے یا الفاظ دیگر سائنس حواس خمسہ کے ذریعہ نتائج اخذ کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس خصوص میں سائنس نے بڑی ترقی کی ہے۔ اور اس کے تجربات اور انکشافات کا سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ سائنس کا دارومدار حواس، مشاہدہ اور تجربہ پر ہے۔ اور یہ بات مسلّمہ ہے کہ حواس اور مشاہدہ میں غلطی کا احتمال ہے۔ مثلاً ریگستان میں سفر کرنے والا مسافر دور سے چمکتی ریت کو دیکھ کر پانی سمجھ بیٹھتا ہے۔ حالانکہ وہ سراب ہے۔ ایک چلتی ہوئی ٹرین کے مسافر کو باہر کی چیزیں

تصوّر پرست ملّاؤں نے

مذہب کو سائنس سے بھڑا دیا

دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسکو التباس کہتے ہیں۔ یہی حال ہمارے دیگر حواس کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حواس ایک حد تک ہمارے علم کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن بالکلیہ ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان سے التباس کا احتمال ہے اس لئے اس کے غیر یقینی اور ناپائیدار اصولوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

سائنس کا ایک دائرہ عمل یہ ہے کہ مادی امور کو مشاہدے اور تجربے سے پہچانے جب مشاہدہ اور تجربہ میں غلطی کا خدشہ ہے تو "مابعد الطبیعاتی مسائل" کا حل کرنا سائنس کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے یہ نہ تو محسوس ہوتے ہیں اور نہ ان کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد مولانا صفحہ ۲۰ پر "ایک غلطی کا ازالہ" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ۔

" یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ سائنس اور مذہب میں تصادم ہے حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ سائنس کی تحقیق کا دائرہ محسوسات کی حد تک ہے اور مذہب کا دائرہ تحقیق غیبی امور سے ہے۔ سائنس کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے مذہب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کے دائرۂ تحقیق میں نہ مداخلت کرتے ہیں اور نہ ان دونوں میں تصادم ہی ہوتا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی معلومات اور ان کے نت نئے انکشافات مذہب اسلام کے سمجھنے میں ممد و معاون ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سائنس دراصل مذہب کا ایک سچا دوست بلکہ فرمانبردار خادم ہے۔ اس کے باوجود اگر سائنس کے انکشافات اور اسلامی تعلیمات میں تصادم نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہیئے تصادم اور تخالف نہیں ہے۔ بلکہ سائنس کا دائرہ تحقیق ابھی نامکمل ہے۔ جب اس کی تحقیقات مکمل ہو جائیں گی تو اسلام کا ترجمان ثابت ہوگا۔

اب آیئے اس باب میں دوسرے موضوع "فلسفہ میں اختلافات کی بنیاد" کی جانب صفحہ ۲۴-۲۵ پر "مادہ سے متعلق خیالات" کے عنوان سے مولانا رقمطراز ہیں کہ۔

(جرمنی کے مادہ پرست فلسفی کانٹ کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے۔)

"ہمارے اثرات و احساسات کا کوئی نمونہ یا صورت نہیں ہے لیکن کوئی چیز ایسی ہے جو ہم میں احساسات رنگ و بو وغیرہ پیدا کرتی ہے۔"

مادہ کے متعلق جب مادیین سے یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ کائنات کی یہ علت یعنی مادہ ذی شعور ہے یا غیر ذی شعور، زندہ ہے یا مردہ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ مادہ پرست کائنات کی علت یا امور مادہ کو قرار دیتے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہ محض ایک خیالی شے ہے۔ لہٰذا مادہ پرستوں کا یہ نظریہ ایک وہم و گمان سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتا۔

(ب) ارسطو کے نزدیک مادہ نہ ایک ہے نہ چند، نہ گرم ہے نہ ٹھنڈا نہ بھاری ہے نہ ہلکا غرض کوئی اثباتی یا ایجابی صفت اس میں نہیں ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ مادہ لاشئ محض یعنی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

(ج) ڈیماکریٹس کہتا ہے، مادہ سالمات اور چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہے اور آج کل یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ برق پاروں (ELECTRONS) سے مرکب ہے اور ایتھر میں تیر رہا ہے۔

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں کہ۔

مادیین کے یہ سارے نظریے خیالی پلاؤ ہیں اس لئے کہ مادہ کو نہ کسی نے دیکھا ہے، نہ محسوس کیا ہے۔ اور نہ اس میں کوئی ایجابی صفت پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عقل یا بحث کے ذریعہ اگر کوئی بات ثابت بھی کی جائے تو وہ صرف ایک لفظ یا ایک نام ہوگا۔ لیکن حقیقت میں اس چیز کا وجود ثابت نہ ہوگا۔ اس کے باوجود مادیین کا اصرار ہے کہ مادہ قدیم اور ازل ہے، یہ ایک وہم ہے جو ان کے دماغوں پر مسلط ہے۔"

سائنس کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرے اور سائنس کے دوسرے طالب علموں کے ذہن میں یہ باب پڑھنے کے بعد جو سوالات جنم لیتے ہیں وہ ذہنی الجھاؤ کا باعث ہوتے ہیں۔

سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے جب میں کلاس روم میں داخل ہوتا ہوں، تو اُستاد مجھے طبیعات یا کیمیا میں جو پہلا باب پڑھاتے ہیں وہ مادہ سے متعلق ہوتا ہے۔ کہ مادہ کیا ہے اور وہ کیوں کر وجود رکھتا ہے۔ طبیعات اور کیمیا کی رو سے ہمارے اطراف و اکناف میں ہونے والی ہر تبدیلی دراصل انہی مادی ذرات کی نہ رکنے والی حرکت کا نتیجہ ہے۔ اور علم کیمیا کی رو سے جتنے بھی کیمیائی عمل وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ دراصل انہی مادی ذرات کی حرکت کا نتیجہ ہیں۔ گویا یوں کہیئے کہ ہم اپنے اطراف و اکناف میں درخت پہاڑ۔ سورج چاند ستارے، سمندر، ریگستان غرضیکہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ مادہ ہے یا مادہ کی مختلف حالتیں ہیں۔ یعنی تمام سائنسی علوم سے روشناس کرانے سے پہلے ایک اہم چیز یا ایک اہم تصور (CONCEPT) سے روشناس کرایا جاتا ہے کہ جس کا نام مادہ ہے۔ چنانچہ ایک طالب علم اسکول کے زمانہ سے کالج میں پہنچنے تک یہ بات اچھی طرح سے جان لیتا ہے کہ اس کے تمام سائنسی علوم کی بنیاد صرف "مادہ" کے وجود پر قائم ہے۔ اب جبکہ وہ شعور کی اس منزل کو پہنچتا ہے جہاں وہ گریجویٹ کہلاتا ہے تو یہ سوالات اس کے لئے بڑی الجھن کا باعث بنتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ وہ سوالات کیا ہیں۔ ہم صفحہ ۲۵ پر اٹھائے گئے مسائل پر بحث کریں گے اور ایک طالب علم کے ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

یہاں ایک بات میں اور عرض کرتا چلوں کہ مصنف نے اپنی کتاب میں "مادہ" پر بحث مادہ کو فلسفہ کی ایک صنف (PHILOSOPHICAL CATAGORY) مان کر کی ہے۔ یعنی مضمون کے اعتبار سے یہ دراصل فلسفہ کا موضوع ہے۔ لیکن شامل نصاب ہونے کے باعث سائنس کے طلباء کا بھی اس سے سابقہ پڑتا ہے۔

"مادہ پرست کائنات کی علت .... ایک وہم ہے جو ان کے دماغوں پر مسلط ہے۔"

اس پیراگراف میں مولانا نے مادہ کے وجود کو ایک خیالی چیز تجویز کرتے ہوئے مادہ کے وجود سے یکسر انکار کیا ہے۔ اور اسے ایک وہم سے تعبیر کیا ہے۔ جو مادیین کے ذہنوں پر مسلط ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ آیا مادہ ذی شعور ہے یا غیر ذی شعور، زندہ ہے یا مردہ۔ یہ سوال ایسا ہے جو بالخصوص فلسفہ کا موضوع ہے اور سائنس اس کا بھی جواب دیتی ہے لیکن اس کے لئے بہت طویل

بحث درکار ہے۔ جو ہمارا موضوع نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ہم اپنے اطراف واکناف میں کچھ بھی دیکھتے ہیں۔ مثلاً سورج چاند ستارے سمندر ریگستان، جانور پودے اور خود ہماری ذات "مادہ" ہے۔ گویا ہم نے بہت سی اشیاء کو ایک نام دیا ہے اور وہ مادہ ہے۔

چنانچہ جب ہم اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں تو یہ بہت سی مادی اشیاء ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر مختلف انداز سے اثر انداز ہوتی ہیں اور ہم کو اپنے بارے میں کھوج لگانے اور پتہ چلانے کی دعوت دیتی ہیں۔ چونکہ یہ تمام اشیاء مادی ہیں، لہٰذا "مادہ فلسفہ کی ایک ایسی صنف ہے یا مادہ وہ شے ہے جو ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر اثر انداز ہو کر ہماری کھوج لگانے والی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اور اس دنیا کے پوشیدہ حقائق کو جاننے کے لئے دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے۔

اس اعتبار سے جب ہم مادہ سے انکار کرتے ہیں تو گویا سائنس اور اس کی تمام شاخوں سے انکار کر دیتے ہیں۔ مثلاً کششِ ثقل یا قوانینِ حرکت کو لیں نیوٹن نے ان قوانین کو دریافت کیا۔ روزمرہ زندگی میں اس نے مختلف مادی مظاہروں یعنی جاندار اور بے جان چیزوں کو حرکت کرتے دیکھا ان کا مشاہدہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ کسی بھی مادی شے میں حرکت پیدا کرنے کے لئے فلاں فلاں اعمال اور حالات کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح کششِ ثقل کو لیجئے اس کے مشاہداتی اور تجرباتی عمل نے اس پر واضح کیا کہ ہر شے زمین کی طرف گرتی ہے، کیونکہ زمین اس شے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہاں لفظِ دریافت (DISCOVERY) اور ایجاد (INVENTION) کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نیوٹن نے ان قوانین کو ایجاد نہیں کیا بلکہ دریافت کیا۔ کہاں سے دریافت کیا؟ اپنے اطراف واکناف میں موجود مادی مظاہروں کے روزمرہ اعمال سے چنانچہ یہ بات واضح ہو گئی کہ جب تک یہ مظاہرے ہی نہ

اسلامیات کی کلاس میں

طلباء کی اکثریت غائب رہی ہے

ہوں گے ان قوانین کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں اور چونکہ یہ مظاہرے سائنس کی اصطلاح میں مادہ ہیں چنانچہ مادہ سے انکار سائنس سے انکار ہے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں مختلف علوم مثلاً علمِ کیمیا، علمِ حیوانات، علمِ ارضیات اور علمِ نباتات وغیرہ سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ بنی نوعِ انسان کا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے ان بہت سے پوشیدہ حقائق کے بارے میں اپنے علم اور عقل کی بنیاد پر کھوج لگایا اور جوں جوں اس کا علم وسیع ہوتا گیا یہ پوشیدہ حقائق اور واضح انداز میں کھل کر سامنے آتے گئے۔ یہی سائنس ہے اور سائنس کے کارنامے، لہٰذا ان مختلف علوم کے لئے لفظِ سائنس بھی ایک بنیادی تصور، (CONCEPT) اور بجائے خود یہ کوئی چیز نہیں، اور موجودہ دور میں تو خاتونِ خانہ کی خانہ داری کا شمار بھی سائنس میں ہوتا ہے۔

جدید سائنسی تحقیق کے بعد یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ مادہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنا وجود صرف تین مختلف حالتوں یعنی ٹھوس مائع گیس میں برقرار رکھے بلکہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت پیش کرنے کے بعد زماں (TIME) اور مکاں (SPACE) کے بلے

نصاب کی کتابیں نہیں ملتیں تو

طلباء کو پرانا کورس پڑھایا جاتا ہے

میں یہ فیصلہ دیا گیا ہے کہ یہ بھی مادہ کے وجود برقرار رکھنے کی ایک قسم ہے یعنی۔

These are the forms of the existance of matter-

اسی طرح سے دنیا میں پائی جانے والی تمام مادی اشیاء کے باہمی رشتے اور معاشرے میں قانونی، معاشرتی، سماجی، تعلیمی، سیاسی اور صحت کے اداروں کے قائم کردہ قوانین جو ان اداروں اور عوام الناس کے باہمی رشتوں کو استوار کرتے ہیں۔ گرچہ رشتے اپنا مادی وجود نہیں رکھتے لیکن مادہ کے وجود برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ضرور ہیں اور اس لحاظ سے وہ صرف قوانین یا رشتے ہی نہیں، بلکہ وہ بجائے خود اپنا ایک وجود رکھتے ہیں! کیونکہ کسی بھی معاشرہ میں پائی جانے والی گھٹن یا آزاد جمہوری فضا کو ان قوانین اور رشتوں کی نسبت سے با آسانی پرکھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان قوانین اور رشتوں کی اس وقت تک کوئی گنجائش نہیں جبکہ وہ اشیاء یا وہ مادی مظاہرے ہی نہ ہوں جن کے درمیان یہ رشتے یا قوانین قائم ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ قارئین میرے اس خیال سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن میرے نزدیک ان قوانین اور ان باہمی رشتوں کی حیثیت یکساں ہے اور یہی ہے۔ یعنی یہ رشتے مادی مظاہروں کے درمیان ہیں۔ ان کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں ان مادی رشتوں کو بہترین بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔

آخرکار ہم یہ سوال خود سے کرتے ہیں کہ یہ جمادات، نباتات و حیوانات بشمول انسان آخر کیا ہیں؟ ان میں کون سی چیز مشترک ہے؟ تو سائنس ہمیں جواب دیتی ہے۔ مادہ ان سب میں مشترک ہے۔ اور یہ تمام اشیاء مادی ہیں۔ اور مادہ کے ازلی اور ابدی ہونے کا ٹھوس ثبوت "قانون بقائے مادہ" ایک اٹل قانون ہے۔ جس کی بنیاد مشاہدات و تجربات پر استوار ہے۔

اب آیئے صفحہ ۱۹ پر۔ مصنف رقمطراز ہیں کہ۔

"یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ... لگاتار مصروف ہے"

اس مختصر سے ٹکڑے میں مولانا نے یہ اعتراف کیا کہ سائنس ہماری "مادی زندگی" میں بڑی سہولت پیدا کر رہی ہے۔ یعنی ایک طرف تو مصنف مادی زندگی کی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسری طرف مادہ کے وجود سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ صفحہ ۱۹ پر ہی مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "مابعد الطبیعاتی" مسائل کا حل سائنس کے بس کی بات نہیں یعنی حیات بعد الممات کا تصور قیامت کا تصور جنت و دوزخ کا تصور غرضیکہ یہ تمام مابعد الطبیعاتی مسائل ہیں لیکن صفحہ ۲۰ پر "ایک غلطی کا ازالہ" کے عنوان سے مولانا فرماتے ہیں کہ سائنس کے نت نئے انکشافات مذہب کو سمجھنے میں نہ صرف ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں بلکہ سائنس مذہب کا ایک سچا دوست بلکہ فرمانبردار خادم ہے۔ اس طرح صفحہ ۲۰ پر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ۔

"مشاہدے سے جو تجربہ حاصل ہوتا ہے اس سے ایک کلیہ یا فارمولا تو بنا لیا جاتا ہے لیکن اس فارمولے میں جو خاصیت بیان کی گئی ہے وہ کہاں سے آئی یہ معلوم کرنا سائنس کے دائرہ تحقیق سے باہر ہے"

مصنف کے اس سوال کا جواب اسی سوال میں پوشیدہ ہے۔ یہاں ہمیں یہ بات

آئن اسٹائن نے

عقل اور دلائل سے

مادہ کا وجود ثابت کیا

اچھی طرح سے جان لینی چاہیئے کہ کسی بھی فارمولے یا حسابی کلیئے میں جو خاصیت بیان کی جاتی ہے وہ خاصیت اس فارمولے میں کہیں اور سے نہیں آتی بلکہ وہ کلیہ یا فارمولا مادی اشیاء کے خواص کے مشاہدہ اور تجربہ سے ہی اخذ کیا جاتا ہے۔ یہ چند اعتراضات جو میں نے پیش کئے ہیں کمرۂ جماعت میں اُستاد اور طلبہ کے درمیان خاصے بحث و مباحثے کا موضوع بنتے ہیں۔ بلکہ کتاب کے کسی دوسرے باب پر اس قدر سوالات نہیں ہوتے جس قدر اس باب پر ہوتے ہیں یہاں میں ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ اس کتاب کے علاوہ ہمارے نصاب میں اور دوسری کتب بھی شامل ہیں جن کے مصنفین مادہ کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اور ان کے نزدیک تنازعے کا مسئلہ صرف مادہ کے از خود شعور ارادہ ادراک اور تعقل کا پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طلبہ یہ سوال کرتے ہیں کہ اس کتاب میں تو یہ لکھا ہے اور دوسری میں یہ، اب کون سا صحیح ہے۔ بتایئے اور تسلی بخش جواب نہ پا کر طلبہ جماعت سے غائب ہو جاتے ہیں، یہ عام مشاہدہ ہے کہ اسلامیات کے گھنٹہ میں حاضری صرف چند لڑکوں تک محدود رہتی ہے۔

موجودہ سائنسی تعلیم

مجھے دوسرے مضامین مثلاً حیوانیات نباتیات وغیرہ کا علم نہیں ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں کیمیا، یا طبیعات کے مختلف موضوعات پر ایک ہی کتاب میں دو تین یا اس سے زیادہ ابواب شامل ہوتے ہیں جو ان موضوعات کا ابتدائی اور مختصر احاطہ کرتے ہیں۔ ابتدائی جماعتوں تک تو یہ بات درست ہے لیکن جب طالب العلم گریجویشن کے درجہ کو پہنچتا ہے تو یہ مختلف موضوعات مثلاً روشنی جوہری طبیعات طیرانیات (ELECTRONICS) ٹھوس اجسام کی طبیعات نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا، طبیعی کیمیا، اس طرح سے علم الحساب میں اختلافی احصاء (DIFFERENTAIL) اور تکمیلی احصاء (INTEGRAL CALCULUS) (CALCULUS)۔ اور جیومیٹری وغیرہ کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ اور چند موضوعات گریجویشن کی سطح پر بھی شامل نصاب کئے جاتے ہیں۔ ان کے احاطہ کے لئے مختلف کتب جامعہ کی طرف سے تجویز کی جاتی ہیں۔ اول تو ان کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ رہتا ہے، جو بیشتر غیر ملکی مصنفین کی ہیں۔ اور اگر مل بھی جائیں تو طرز امتحان کی وجہ سے طالب علم انھیں دلچسپی سے نہیں پڑھتا۔ کیونکہ مروجہ طریقہ امتحان میں طالب علم کو اپنی سال بھر کی قابلیت کے اظہار کے لئے صرف تین گھنٹے ملتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان کتابوں سے صرف ایک یا دو سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ مثلاً بی۔ ایس۔ سی سال دوئم میں طبیعی کیمیا سے اگر چار سوال کرنے ہوتے ہیں تو نامیاتی کیمیا کی کتاب جو ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، اسے صرف دو سوالوں کا جواب دینا ہوتا ہے۔ اس طرح سے حساب کے پرچہ الف میں بی ایس سی سال اوّل میں علم احصاء کے ساتھ (COORDINATE GEOMETRY) بھی شامل ہوتی ہے اور اس میں سے چار سوال آتے ہیں۔ بی۔ ایس۔ سی سال دوئم میں ۲،۲ میں کتابوں کی فراہمی نہ ہونے کے باعث پرانا کورس شامل نصاب کر لیا گیا تھا، اور اس نصاب کے لحاظ سے سال دوم کے طلبہ کو جیومیٹری میں سے صرف ایک، یا دو سوال کرنے تھے چارسو صفحات کی کتاب میں سے منتخب شدہ چند باب جن میں پڑھانے کے لئے چند ابواب کے انتخاب کے بعد اس کتاب کے پڑھانے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ قارئین اس کا اندازہ خوب لگا سکتے ہیں۔ یہی کیفیت دوسرے مضامین کے ساتھ بھی ہے۔ اور یہی صورت پریکٹیکل میں بھی پیش آتی ہے۔ کہ نئے نصاب میں چند نئے اور اعلیٰ معیار کے پریکٹیکل شامل نصاب کئے جاتے ہیں۔ لیکن سامان کی فراہمی نہ ہونے کے باعث صرف چند شامل نصاب رہ جاتے ہیں اور باقی علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا لے دے کر وہی پرانی چیز چند نئی چیزوں کے ساتھ شامل نصاب رہ جاتی ہے۔

مسئلہ کا حل

اس مسئلہ کے مختلف حل ہو سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ نظام تعلیم کو سرے سے تبدیل کیا جائے اور اسے کسی خاص فلسفۂ زندگی سے ہم آہنگ کیا جائے۔ بالخصوص طریقہ امتحان کی تبدیلی پر توجہ دی جائے۔ ساتھ ساتھ طالب علم کا ذہنی رجحان معلوم کرنے کی غرض سے، (APTITUDE TEST) ہونے چاہئیں۔ ابتدائی جماعتوں میں اس صورت حال پر ان تبدیلیوں کے ذریعہ قابو پایا جا سکتا ہے۔ طریقہ امتحان میں تبدیلی کا جب بھی ذکر آتا ہے۔ (OBJECTIVE) طریقہ امتحان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے امتحان سے علمیت کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ اس طریقہ امتحان میں طالب علم کو کسی بھی نئے یا مضمون کے بارے میں اپنی صلاحیتوں کے مکمل اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ اور دوسرے یہ کہ طالبعلم کثیر مطالعہ کا عادی نہیں ہوتا۔ ادب اور فن میں یہ طریقہ امتحان بہت مہنگا پڑے گا۔ چنانچہ طریقہ امتحان وضع کرنے سے پہلے ان خرابیوں پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔

ایسے مضامین جن کا وطن عزیز کی ترقی سے گہرا تعلق ہے۔ بالخصوص سائنس کے مضامین۔ ان مضامین میں گریجویشن صرف ایک مضمون میں کرایا جائے۔ اور طالب علم کو کسی خاص مضمون میں ماسٹر ڈگری لینے کا موقع جو گریجویشن کے بعد دیا جاتا ہے وہ اُسے انٹر سائنس کے بعد دیا جائے۔ یعنی وہ گریجویشن اپنے پسندیدہ مضمون میں کرے اور پھر ماسٹر ڈگری حاصل کرے۔ گریجویشن میں تعلیم کے معیار کو اور بلند کیا جانا چاہیئے۔ اور تعلیمی سال کے سلیبس میں پورے وقت کے ایک تہائی کو عملی تجربے کے لئے وقف کیا جائے۔

قومی زبان میں تعلیم

تعلیم زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ تاکہ وہ پوری طرح سے نفس مضمون کو سمجھ سکے۔

ہمیں اپنی صوبائی زبانوں میں تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک قومی زبان کا بھی انتخاب کرنا ہوگا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ فی الحال تعلیم بشمول اعلیٰ تعلیم ابھی صوبائی زبانوں میں ناممکن ہے۔ اور اگر کوئی زبان اس کمی کو پورا کر سکتی ہے تو وہ فی الحال اردو ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو تنازعہ کا مسئلہ بنانے کے بجائے ہم کو اپنے اپنے میدان میں زیادہ سے زیادہ محنت، کام اور تحقیق و جستجو کرنی چاہیئے تاکہ ہماری قومی اور صوبائی زبانوں کے ساتھ ساتھ وطن عزیز بھی ترقی کرے اور عوام الناس کی حالت بہتر ہو۔

مزدوروں پر فائرنگ

محمد اکرم داؤد کاٹن ملز مزدور یونین کے اہم عہدیدار اور مزدور کسان پارٹی لانڈھی کورنگی کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ ان پر لانڈھی کورنگی کے مزدور طبقہ کو اعتماد ہے۔ موجودہ مزدور تحریک کے رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔ جس کے جرم میں موجودہ حکومت نے ان کے خلاف ڈی پی آر کے تحت وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہیں۔ ۱۷-۱۸ اکتوبر کی درمیانی شب داؤد کاٹن ملز میں ہی موجود تھے۔ اس کے بعد سے نیو مظفر آباد کالونی میں ہونے والے پہلے جلسے سے خطاب کیا۔ اور جب ہی سے روپوش ہیں۔ (ادارہ)



محنت کشوں کے طبقاتی اتحاد کا جواب گولیوں سے دیا گیا

محمد اکرم

۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو مشین ٹول فیکٹری لانڈھی کے مزدوروں کی جانب سے ان کی نمائندہ یونین نے انتظامیہ کو مطالبات پیش کئے۔ ان مطالبات میں سے دو یہ تھے کہ اول۔ پی۔ آئی۔ ڈی سی کی اپنی وضع کردہ پالیسی لیٹر مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء کا اطلاق مشین ٹول فیکٹری میں بھی کیا جائے۔ مشین ٹول فیکٹری کے چیئرمین نے اصولی طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا لیکن وہ اس کے تحت الاؤنسوں کی ادائیگی مارچ ۱۹۷۳ء میں کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ ہیڈ آفس کے ملازمین کو ادائیگیاں مارچ ۷۲ء سے کی گئی ہیں۔ منطقی طور پر یونین کا مطالبہ تھا کہ مشین ٹول فیکٹری

لانڈھی کورنگی کے مزدوروں پر
منظم حملے کی تیاریاں پہلے سے کر لی گئی تھیں



لانڈھی کے ملازمین کو بھی الاؤنسوں کی ادائیگی مارچ ۱۹۷۲ء سے کی جائے۔ دوئم انتظامیہ اور یونین کے مابین ہونے والے ۱۹۶۹ء کے معاہدے کے تحت حاضری الاؤنس دیا جائے۔ مطالبات پیش کرنے کے بعد مزدوروں کا یہ تسلیم شدہ حق ہے کہ وہ دس دن بعد ہڑتال پر جا سکتے ہیں۔ لیکن مشین ٹول فیکٹری کی مزدور دشمن انتظامیہ نے اس سے قبل ہی غیر قانونی طور پر تالہ بندی کر دی اور اس طرح ڈھائی ہزار مزدوروں کو جبری ہڑتال پر مجبور کر دیا۔

تالہ بندی سے دو روز قبل یونین کے جنرل سیکرٹری کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو کارخانے کے گیٹ پر پولیس کی بھاری جمعیت تعینات کر دی گئی۔ فیکٹری بلڈنگ پر مشین گنیں فٹ کر دی گئیں۔ کالونی میں رہنے والے ملازمین کو ہراساں کرنے کے لیے جنرل مینیجر کے گھر پر بھی مشین گن فٹ کر دی گئی۔ اسی دن یونین کے پانچ کارکنوں کو فیکٹری کے گیٹ پر گرفتار کر لیا گیا۔ ۲۳ ستمبر کو پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ فیکٹری میں تالہ بندی کر دی گئی۔ مزدوروں کو زبردستی بسوں سے اتار کر مارا پیٹا گیا۔ اور چالیس مزدوروں کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

مشین ٹول فیکٹری کے دس یونین کے عہدیداروں اور کارکنوں کے خلاف ڈی۔ پی۔ آر کے تحت وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے۔ ان میں سے پانچ کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

مشین ٹول فیکٹری کے ڈھائی ہزار پُرامن مزدوروں پر یہ تشدد کب تک جاری رہتا اور ان کے طبقاتی بھائی کب تک خاموش رہتے۔ آخر لانڈھی کورنگی لیبر آرگنائزنگ کمیٹی نے لانڈھی کورنگی کے اسی ہزار مزدوروں کی جانب سے مشین ٹول کے بھائیوں کی امداد اور حمایت کا فیصلہ کیا۔ دو دن کی علامتی مکمل ہڑتال کی گئی۔ ان دو دنوں کی علامتی مکمل ہڑتال میں لانڈھی کورنگی کے تمام مزدوروں نے براہِ راست حصہ لیا اور پورا صنعتی علاقہ بند رہا۔

اس کے بعد لانڈھی کورنگی لیبر آرگنائزنگ کمیٹی کی جانب سے فیصلہ کیا گیا کہ تمام مزدور ساتھی روزانہ ہر شفٹ میں دو گھنٹے علامتی طور پر ہڑتال کر کے مشین ٹول فیکٹری کے مزدوروں کی جائز اور منصفانہ جدوجہد میں ان کی مدد کریں۔ اس صنعتی علاقے کے تمام مزدوروں نے اس فیصلہ پر لبیک کہا اور اس طرح انتہائی پُرامن طور پر لانڈھی کورنگی کے مزدور اپنی جدوجہد آگے بڑھاتے رہے۔

مشین ٹول فیکٹری کے مزدوروں کے علاوہ پورے کراچی کے مزدوروں کے مسائل بھی ان دنوں کافی پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ کراچی کے لاکھوں محنت کش ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا ہیں۔ منگھوپیر کے صنعتی علاقے میں تقریباً اسی فیکٹریوں میں تالہ بندی کر دی گئی ہے جبکہ لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے میں چھ کارخانوں میں تالہ بندی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر کارخانے سے انتہائی بے دردی کے ساتھ مزدوروں کی چھانٹی ہوتی رہی ہے۔ اور اب بھی جاری ہے۔ جس کے نتیجے میں کراچی میں تقریباً ۲۵ ہزار مزدور بیروزگاری جیسی خوفناک بلا کا شکار ہیں۔ بھوک، افلاس، بیماری اور بے مکانی کی کیفیت نے ان سے درحقیقت زندگی چھین لی ہے۔ یہ ہزاروں زندہ لاشیں کب تک خاموش رہ سکتی تھیں۔ ایک روز تو ان خاموش آتش فشاں پہاڑوں کو لاوا اگلنا تھا۔

پس لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے کے اسی ہزار مزدور صبر و ضبط کے دامن کو چھوڑ بیٹھنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ ان کے بھوکے پیٹ میں ہونے والے پُرتشدد ہنگاموں نے آخر ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی مصیبتوں، دکھ اور تکلیفوں سے لوگوں کو آشکار کریں۔ اس طرح واحد مشین ٹول فیکٹری کا مسئلہ صرف کراچی بلکہ ملک بھر کے محنت کشوں کا مطالبہ بن گیا۔ اب مطالبات کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ۔

۱۔ تالہ بندی ختم کرو۔
۲۔ چھانٹیاں بند کرو۔
۳۔ مشین ٹول فیکٹری کے مزدوروں کے مطالبات پورے کرو۔
۴۔ گرفتار شدہ مزدور رہنماؤں اور مزدور کارکنوں کو رہا کرو۔
۵۔ ڈی۔ پی۔ آر کا نفاذ مزدوروں پر فوراً ختم کرو۔

لانڈھی کورنگی کے مزدور طبقہ کی یہ جدوجہد انتہائی پُرامن طور پر جاری تھی۔ مزدور جلسہ، جلوس کے ذریعے اپنے ناقابلِ شکست اتحاد اور غیر متزلزل عزم و یقین کا اظہار کر رہے تھے۔ فیکٹریوں کے احاطوں، کارخانوں کے گیٹوں اور مزدور بستیوں میں مزدور اپنا طبقاتی اتحاد پیدا کر رہے تھے۔ اور اس طرح مزدوروں کی صف بندی جاری تھی۔ دوسری طرف لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے کے مزدور نمائندے صوبائی وزیر محنت ستار گبول سے مزدوروں کے مسائل پر مذاکرات کر رہے تھے۔ لیکن ستار گبول کا رویہ انتہائی طور پر ناقابل قبول تھا۔ اس کی وجہ حکومت کی عالیہ پالیسی ہے۔ جس میں اس کا سرمایہ داروں کی جانب زیادہ جھکاؤ ہے۔ اور مزدوروں کو ملک دشمن ثابت کرنے کی کوششیں شامل ہیں۔

آخر روز روز کے ٹال مٹول سے تنگ آ کر لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے کے مزدور نمائندوں نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ مذاکرات کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ موجودہ حکومت اور اس کے کارندوں کے خلاف مزدور طبقہ کی انتہائی نفرت کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی موجودہ حکومت کے وحشیانہ کارروائیوں سے انتہائی طور پر نفرت کرتے ہیں اور تنگ آ چکے ہیں۔

اس کے بعد سرمایہ داروں، نوکر شاہی اور موجودہ حکومت نے منظم طور پر مزدور

صوبائی وزیر محنت کا رویہ
شروع سے آخر تک منفی رہا

طبقہ کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا۔ آئے دن اخبارات میں کسی نہ کسی فیکٹری یا کارخانے کی انتظامیہ کی جانب سے بھٹو صاحب کے نام ایک انتہائی دردمندانہ اپیل شائع ہوئی تھی کہ جناب لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے میں مزدور تشدد پر آمادہ ہیں۔ آج فلاں مل کے مینیجر کو مارا گیا۔ آج فلاں مل کی انتظامیہ کا گھیراؤ کیا گیا۔ صنعتی امن تباہ ہو رہا ہے۔ ملک بحران کا شکار ہے۔ ملک کی سلامتی کو خطرہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

حکومت نے اس قابلِ نفرت مہم میں اس طرح اپنا حصّہ ادا کیا کہ روزانہ کسی نہ کسی عہدیدار نے، حکومتی کارندے نے، نوکر شاہی کے نمائندے نے یا وزیر مشیر نے مزدوروں کے خلاف لمبے چوڑے بیان دینا شروع کیے۔ موجودہ حکومت جو مزدوروں کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کی عملی حمایت اور ووٹ کے سبب برسرِ اقتدار آئی ہے اب مزدوروں اور ان کے نمائندوں کے خلاف خوب خوب زہر اگل رہی ہے۔ بہت سے مداری اپنا اپنا کرتب دکھا رہے ہیں۔ خوش الحان اپنے اپنے سُروں میں مزدور دشمنی کے گیت گا رہے ہیں۔ ہر گویّا، ہر خطیب، ہر مقرر غرض کہ جو بھی اٹھ رہا ہے، مزدوروں کو جارح قرار دے رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ مزدوروں کو تعاون کرنا چاہیئے۔ مزدوروں کو تشدد کی راہ پر نہیں چلنا چاہیئے۔ ہڑتالوں سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ نام نہاد مزدور لیڈروں نے مزدوروں کو بہکایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسطرح کے بیانات آنے لگے کہ اگر مزدور راہِ راست پر نہ آئے تو ان سے سختی سے نمٹا جائیگا۔

اخبارات، رسل و رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن، غرض ہر ذریعے سے مزدوروں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ اور شہری درمیانے طبقے کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دیکھیے جناب مزدور تو انتہائی غلط کارروائیوں میں مصروف ہیں۔

مزدور طبقہ اور ان کے نمائندہ تنظیمیں، جماعتیں اس سازش کو اچھی طرح بھانپ گئی تھیں اس لئے انہوں نے پوری کوشش کی کہ ان کی آواز بھی لوگوں تک پہنچے لیکن ہر طرح سے ان کی آواز کو روکا گیا۔ اخبارات میں دیئے جانیوالے بیانات ایک تو چھاپے نہیں جاتے تھے اور اگر کبھی غلطی سے کوئی خبر چھپ بھی گئی تو اس طرح توڑ مروڑ کر کہ اس کا مطلب ہی تبدیل ہو جاتا تھا۔

بہر حال جب دشمن طبقات، نوکر شاہی اور حکومت نے اپنے طور پر ساری کارروائیاں کرلیں تو پھر مزدور طبقہ کے اتحاد کو توڑنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ ملوں کے مالک، کارخانوں کی انتظامیہ کارخانوں اور ملوں سے بھاگ گئی۔ اور مزدوروں پر الزام رکھا کہ اب تو مزدور اتنے بڑھ گئے ہیں کہ انتظامیہ کو کام کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا جا رہا ہے۔ پس خصوصی طور پر داؤد کاٹن ملز اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے کارخانے داروں اور انتظامیہ کے دیگر چار کارخانوں سے انتظامیہ فرار ہو گئی۔



نیو مظفر آباد لانڈھی میں مزدوروں کے جلسہ سے داؤد کاٹن ملز لیبر یونین کے صدر محمد اکرم خطاب کر رہے ہیں۔

مزدور بستی کو خوفزدہ کرنے کے لئے
عمارتوں پر مشین گنیں فٹ کر دی گئیں

لانڈھی کورنگی کے صنعتی علاقے میں پولیس کا راج ہو گیا۔ پولیس کی جیپیں، ٹرک اور گاڑیاں گرد و غبار کے بادل اڑانے لگیں۔ ادھر ہر طرف دہشت کا بازار گرم کیا جانے لگا۔ مزدوروں کو پولیس اور رینجرز کے حملے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ . . داؤد کاٹن ملز، گل احمد ٹیکسٹائل ملز اور دوسرے کارخانے کے مزدور رہنماؤں کے خلاف بھی ڈی۔ پی۔ آر کے تحت وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے۔ مزدوروں سے کہا گیا کہ وہ اپنے رہنماؤں کو پولیس اور حکومت کے حوالے کر دیں۔ مزدوروں نے انتظامیہ کے فرار ہونے کے بعد داؤد کاٹن ملز اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنا لیا۔ تمام رہنما ہر وقت ملوں میں مزدوروں کے ساتھ رہنے لگے اور اپنے رہنماؤں کے تحفظ کیلئے ترکیب سوچی گئیں۔ بہر حال مزدوروں نے حکومت کو جواب دیدیا کہ مزدور لیڈروں کو تمہارے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ جتنے مزدور رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا ہے ان کو بھی فوراً رہا کیا جائے۔

پولیس اور رینجرز نے حملے کی دھمکی دی لیکن مزدور ناقابل تسخیر چٹان کی طرح مستحکم رہے۔ کئی دفعہ ملوں کو گھیرے میں لیا گیا لیکن پھر نہ جانے کن مصلحتوں کے تحت گھیرا اٹھا لیا گیا۔ اس کے جواب میں مزدوروں نے اپنے تمام ساتھیوں کو حالات سے باخبر رکھنے کے لئے پیغام رسانی کا عمدہ انتظام کیا۔ پولیس اور رینجرز کی نقل و حرکت کے تحت سائرن بجا کر تمام مزدوروں کو باخبر کیا جانے لگا۔ ممکنہ حملوں کے خلاف صف بندی کی گئی۔ غرض کہ ہر طرح سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد پوری تندہی اور سوچ و بچار کے ساتھ جاری رہی۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو پولیس اور رینجرز نے داؤد کاٹن ملز کو گھیرے میں لے لیا۔ مزدوروں نے اپنے تحفظ کے لئے مجبوراً دھمکی دی کہ اگر پولیس نے جبری طور پر مل میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہ جوابی کارروائی کے طور پر کارخانے کے بوائلر اور ٹینکر کو اڑا دیں گے، جس سے لانڈھی کورنگی کا پورا صنعتی علاقہ بری طرح متاثر ہو جائیگا۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور پولیس اور رینجرز نے محاصرہ ختم کر دیا۔

اس کے ایک دن بعد یعنی ۱۷، ۱۸ر اکتوبر کی درمیانی شب میں پھر داؤد کاٹن ملز کو پولیس اور رینجرز نے گھیرے میں لے لیا۔ یہ کارروائی انتہائی خفیہ طور پر کی گئی تھی لیکن پولیس جیسے ہی صنعتی علاقے میں داخل ہوئی مزدوروں نے سائرن بجا کر اپنے تمام مزدور ساتھیوں کو مطلع کر دیا۔ پولیس نے یہ کارروائی جس انداز میں کی اس سے معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارے سپاہی بھارتی توسیع پسندوں کے خلاف منصوبے بنا کر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ خود سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بیان کے مطابق یہ کارروائی انتہائی خفیہ اور دس دن کی مسلسل سوچ و بچار اور منصوبہ بندی کے بعد عمل میں لائی گئی۔ اس حملے کو منظم کرنے میں بہت سے ماہرین نے حصہ لیا۔ علاقہ کا نقشہ تیار کیا گیا، دیواروں کی اونچائیاں ناپی گئیں۔ دکانوں اور مزدور بستیوں کے نقشے تیار کئے گئے۔ ایک کارخانے کی چھت پر چڑھ کر داؤد کاٹن ملز اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز کا فضائی جائزہ لیا گیا۔ ایس ایس پی نے مزید کہا کہ ان تمام کارروائیوں کے باوجود ہم مزدوروں پر غیر متوقع حملہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ۴½ بجے صبح کا وقت چنا گیا تاکہ رات کے اندھیرے کا بھی فائدہ اٹھایا جا



سکے۔ اور ڈیوٹیوں کی تبدیلی کا بھی وقت نہ ہو۔ کیونکہ ۷ بجے صبح، ۳ بجے شام اور ۱۱ بجے رات کو مزدوروں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ اور ایسے موقعوں پر مزدوروں کی اوسط تعداد دگنی ہو جاتی ہے۔

پولیس نے بلڈوزر، سیڑھیاں، ایسی جیپیں جن پر ایمپلیفائر لگے ہوئے تھے۔ ایمبولینس، فائر بریگیڈ کی گاڑیاں استعمال کی گئیں۔ خود پولیس کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کیا، ایک جتھے نے مل کا محاصرہ کر لیا۔ دوسرا جتھہ کارخانے کی پشت سے حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اور تیسرے حصے کو کارخانے کے عین گیٹ سے حملہ کرنا تھا۔ حملہ شروع کرنے سے قبل بجلی، پانی، ٹیلیفون اور گیس پاور بھی کاٹ دیا گیا تاکہ مزدوروں کو بے دست و پا کر دیا جائے۔

پولیس اور رینجرز نے داؤد کاٹن ملز کے مین گیٹ کے سامنے گولیاں چلائیں اور آنسو گیس کے گولے پھینکے اور پھر بلڈوزر سے مل کا گیٹ توڑ ڈالا۔ اس کے علاوہ پیچھے سے حملہ کرنے والے جتھے نے مل کی دیوار کو بلڈوزر سے توڑ دیا۔ اور اندر داخل ہو گئے۔ مزدوروں نے بڑی دلیری کے ساتھ پولیس کی جارحیت کا مقابلہ کیا۔ پولیس نے بے رحمی سے لاٹھی چارج کی، اور آنسو گیس استعمال کی۔ اس طرح داؤد کاٹن ملز میں درجنوں مزدور زخمی ہوئے اور سینکڑوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس معرکہ کو فتح کرنیکے بعد پولیس اور رینجرز نے گل احمد ٹیکسٹائل ملز پر دھاوا بول دیا۔ گولیاں چلائیں اور اسی طرح بلڈوزر سے ہاسٹل والی دیوار توڑ کر گل احمد ٹیکسٹائل ملز میں داخل ہو گئے۔ گل احمد ٹیکسٹائل ملز میں تو دہشت گردی کا عجب ماحول پیدا کر دیا لیکن گل احمد کے بہادر مزدوروں نے نہایت منظم طور پر پولیس کے تشدد کا مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں کئی مزدور شہید، درجنوں زخمی ہوئے اور سینکڑوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے صدر جناب ٹکا خان بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز پر زبردستی قبضہ کر کے مالکان کے حوالے کر دیا گیا۔

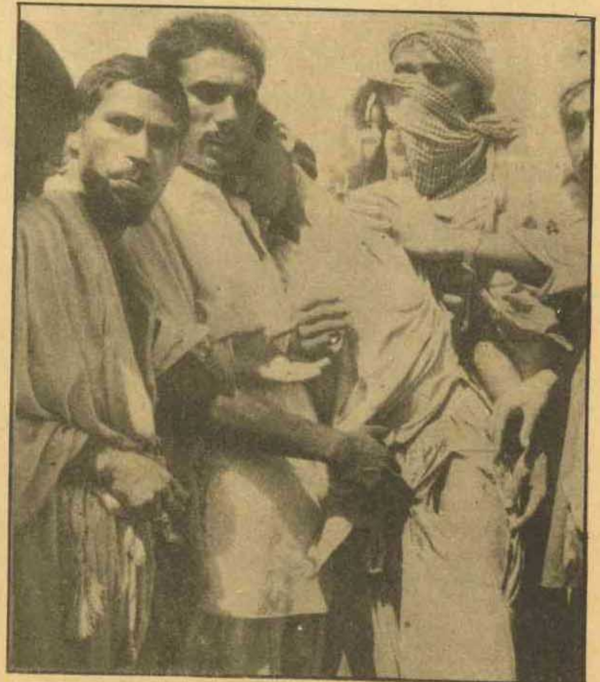
ان تمام دہشت انگیز کارروائیوں کے باوجود مزدوروں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے شہید ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اور اس وقت تک جدوجہد جاری رکھیں گے جب تک کہ مزدوروں کے جائز مطالبات پورے نہیں کئے جاتے۔ مزدوروں کا پہلا جلسہ فائرنگ کے فوراً بعد ۸ بجے شب نیو مظفر آباد کالونی میں کاکا زرین خاں صدر مزدور کسان پارٹی لانڈھی کورنگی کی قیادت میں منعقد ہوا جس میں جدوجہد میں شہید ہونیوالے

اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن نے
نوکر شاہی کے جرائم پر پردہ ڈالا

ساتھیوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، اور جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم کیا گیا۔

۱۷، ۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کی اس ظالمانہ کارروائی کے بعد مزدوروں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی ہے۔ روز آنہ وہ جلسے جلوس منعقد کر رہے ہیں۔ اور ہر لمحہ ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کے بعد آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ پس مزدور انتہائی وحشیانہ مظالم کا شکار ہونے کے باوجود بہت ہی پُر سکون انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کہ ۲۲ر اکتوبر کو پھر پولیس نے مزدوروں کو ریڑھی کی پہاڑی پر گھیرنے کی کوشش کی لیکن ان کی یہ کوشش مزدوروں نے ناکام بنادی۔ اس کے بعد ۲۳ر اکتوبر کو صبح دس بجے مزدوروں کا جلسہ ریڑھی کی پہاڑی پر منعقد ہو رہا تھا کہ پولیس نے مزدوروں کو دو اطراف سے گھیرنے کے لئے آگے بڑھنا شروع کیا۔ مزدوروں نے انتہائی ہوشیاری سے پسپائی اختیار کرتے ہوئے بستی کا رخ کیا لیکن اس کے باوجود پولیس تشدد پر آمادہ نظر آتی تھی۔ مزدور جیسے ہی مزدور بستی کے نزدیک پہنچے پولیس نے آنسو گیس کے گولے پھینکنے شروع کئے۔ مزدوروں نے بڑی دلجمعی کے ساتھ اس ظالمانہ کارروائی کو برداشت کیا لیکن اس پر بھی کراچی انتظامیہ اور حکومت کو سکون میسّر نہ آیا تو انہوں نے مزدوروں پر پھر فائرنگ کا حکم دے دیا، اور کئی مزدور شہید ہو گئے، درجنوں زخمی ہوئے، بہت سے مزدوروں کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ پولیس نے اتنی سنگدلی سے آنسو گیس اور گولیاں برسائیں کہ بستی میں موجود خواتین اور بچے بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔

مزدوروں کا اتنا خون بہانے کے باوجود حکومت، سرمایہ دار اور نوکر شاہی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ ہڑتال کو بارہ دن ہو چکے ہیں، مذاکرات ناکام ہو چکے ہیں۔ حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے اور کھل کر سرمایہ داروں کی حمایت کر رہی ہے۔ اگر حکومت کا خیال ہے کہ وہ اس طرح مزدوروں کی جدوجہد کو ناکام بنادے گی تو یہ ان کا غلط خیال ہے۔ مزدور



پوری طرح متحد ہیں۔ ہمارے عزم، یقین اور اتحاد کا اندازہ لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے کی صورتِ حال سے کیا جا سکتا ہے۔ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک تالہ بندیوں کو ختم نہیں کیا جاتا، چھانٹیوں کو بند نہیں کیا جاتا، فائرنگ کی عدالتی تحقیقات نہیں ہوتی، مشین ٹول فیکٹری کے مزدوروں کے مطالبات تسلیم نہیں کیے جاتے، مزدور رہنماؤں کو رہا نہیں کیا جاتا، ڈی پی آر کا مزدوروں پر اطلاق ختم نہیں کیا جاتا۔

یہ بات بالکل صاف ہے کہ یہ ہماری آخری لڑائی نہیں ہے لیکن آخری لڑائی زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ آخری لڑائی میں ہماری فتح ہوگی —— وہ فتح انقلاب ہوگا، مزدور کسان انقلاب! جس کے بعد جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا وجود ختم ہو جائے گا لیکن جب تک یہ لوٹ کھسوٹ کا موجودہ نظام قائم ہے۔ پاکستان کے جیالے مزدور اپنے شہیدوں کے خون سے روشن راہ پر آگے بڑھتے رہیں گے اور قربانیاں دیتے رہیں گے۔

مزدور طبقے نے موجودہ حکومت سے کوئی امید وابستہ نہیں کی ہے۔ مزدور طبقہ دوسرے محنت کش طبقات کے ساتھ روزِ اوّل سے لوٹ کھسوٹ اور استحصال سے آزادی کی جدوجہد کر رہا ہے۔ آج تک جتنے بھی نام نہاد معاشی و سیاسی سہولتیں ملی ہیں، وہ سب مزدوروں کسانوں اور دوسرے محنت کش طبقوں کی باہمی جدوجہد کا ہی نتیجہ ہے۔ مزدور طبقہ کسی خیرات یا بھیک کا طالب نہیں ہے بلکہ اس نے ہی ان لوگوں کو اقتدار بخشا ہے جو الیکشن کے زمانے میں ووٹوں کے بھکاری بن کر ان کے پاس آئے تھے۔ جو لوگ اقتدار بخش سکتے ہیں وہ اقتدار چھین بھی سکتے ہیں۔

تشدّد کی راہ

مزدوروں پر عرصہ دراز سے سرمایہ دار اور انتظامیہ الزام تراشیاں کر رہی ہے کہ وہ تشدّد کی راہ پر گامزن ہیں، مذاکرات سے کتراتے ہیں، ہڑتالوں، گھیراؤ اور قبضہ کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومت نے بھی سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے اس گھناؤنے الزام کی تائید شروع کر دی ہے۔ اخبارات میں روزانہ ڈپٹی کمشنر کراچی، وزیرِ محنت ستار گبول، مرکزی وزیرِ محنت محمد حنیف اور دوسرے سرکاری اہلکار مزدوروں کے بارے میں پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ ان کا رویّہ غیر معقول اور غیر مناسب ہے اور سب سے مضحکہ خیز بات تو مرکزی وزیرِ محنت نے کی ہے کہ اس ہڑتال کے پیچھے غیر ملکی سازشی عناصر ہیں۔ اس طرح کی الزام تراشیاں کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پیشتر یحییٰ، ایوب خان بھی ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ مزدور اچھی طرح باخبر ہیں کہ ۷، ۸ر جون ۱۹۷۲ء کو منگھوپیر کے مزدوروں پر پولیس نے گولیاں چلائیں اور انتہائی تشدّد کے ذریعے مزدور تحریک کو دبانے کی کوشش کی اور فوری طور پر مزدوروں کی اس جدوجہد کو غیر ملکی سازش قرار دیا۔ اب یہی بات ۱۷، ۱۸ر اکتوبر کی درمیانی شب اور ۲۳ر اکتوبر کو مزدور طبقہ پر پولیس کی جارحیت اور وحشیانہ سلوک پر پردہ ڈالنے کے لیے کی جا رہی ہے کہ ایسے نازک موقع پر جب کہ فوجوں کی واپسی کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ ہڑتال کر کے مزدوروں نے حکومت کی پوزیشن کمزور کرنے کی کوشش کی ہے وغیرہ وغیرہ:

لانڈھی کورنگی کے مزدوروں نے ہڑتال کے دو دنوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کا مطالبہ کیا تھا لیکن حکومت نے غیر معقول اور مزدور دشمن رویّہ اختیار کر کے مزدوروں پر تشدد کیا اور اس طرح مزدوروں کو جبری ہڑتال پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ ہڑتال کو بارہ دن ہو رہے ہیں۔ لانڈھی کورنگی کے ۰ ہزار مزدوروں کی ایک دن کی تنخواہ دس لاکھ روپے بنتی ہے اس طرح ہڑتال کے دنوں کی واجب الادا اجرت میں روزانہ دس لاکھ روپے کا اضافہ ہو رہا ہے۔ مزید یہ کہ خود مرکزی وزیرِ محنت کے بیان کے مطابق ہڑتال سے روزانہ ۰۴ لاکھ

شہید مزدوروں کے

ویران گھر

پیپلز پارٹی سے جواب مانگ رہے ہیں

روپے غیر ملکی زرِ مبادلہ اور بیس لاکھ روپے ٹیکس کا نقصان ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے کے ۸۰ ہزار مزدور خاندانوں کی معاشی اور اقتصادی بدحالی پر کسی وزیر یا مشیر نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ مزدور گھرانوں میں کھانے کے لیے روٹی نہیں ہے اور لاکھوں محنت کش بھوک کا شکار ہیں۔

یہ سرمایہ داری، نوکر شاہی اور حکومت کی وطن دشمنی ہے کہ جب ملک کو زرِ مبادلہ کی ضرورت ہے ناجائز ضد پر اڑ کر ۴۰ لاکھ روپے غیر ملکی زرِ مبادلہ کا روزانہ نقصان کیا جا رہا ہے۔ یہ سرمایہ داری نوکر شاہی اور حکومت کی عوام دشمنی ہے کہ جب ملکی ترقی کے لیے روپے کی ضرورت ہے، روزانہ بیس لاکھ روپے ٹیکس کا نقصان برداشت کیا جا رہا ہے لیکن مزدوروں کو ان کی جائز اجرت نہیں دی جا رہی۔

حکومت کو سرمایہ داروں کی حمایت کی بجائے ہوشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مزدوروں کے مطالبات کو تسلیم کر لینا چاہیئے تھا۔ حکومت کا ہمیشہ یہ رویہ رہا ہے کہ جب بات گزر جاتی ہے تو وہ چیخ و پکار شروع کرتے ہیں۔ سانپ کے گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ!

جہاں تک ملوں پر قبضے کا سوال ہے۔ مزدوروں پر یہ سراسر الزام ہے۔ مزدوروں نے ہمیشہ مفاہمت کا رویّہ اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ داروں اور انتظامیہ کا رویّہ ہی غیر مفاہمانہ رہا ہے۔ ہر قبضے کے پیچھے ایک طویل مفاہمتی گفتگو کی ناکامی ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر اسی طرح ہوا ہے کہ مزدوروں نے اپنے مطالبات انتظامیہ کو پیش کیے۔ انتظامیہ نے اس پر سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور مطالبات کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ منطقی طور پر مزدوروں نے اس پر احتجاج کیا تو سرمایہ دار انتظامیہ ملوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی اور الٹا مزدوروں پر الزام لگا دیا کہ مزدور صنعتی پیداوار میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ مزدوروں کے پاس نہ تو دولت کی ریل پیل ہے اور نہ اس کے قبضے میں ابلاغ کے ذرائع ہیں جس کے ذریعے وہ ان الزام تراشیوں کا جواب دے سکیں۔ مزدور طبقہ انتہائی پرامن طور پر جدوجہد کر رہا ہے۔ اس کو ملوں پر قبضہ مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ اس کے جائز مطالبات اگر پورے کر دیئے جائیں، اُجرتیں ادا کر دی جائیں۔ خواہ مخواہ پریشان نہ کیا جائے تو ہڑتال گھیراؤ یا قبضہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔

مُلک دشمن کون ہے؟

عوام اس سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ اسی سرمایہ دارانہ، جاگیر دارانہ استحصال اور نوکر شاہی کے جبر و تشدد نے ملک کی ۶۰ فیصد آبادی کو علیحدگی پر مجبور کر دیا اور سنہرا بنگال ہمیشہ کے لیے پاکستان سے علیحدہ ہو گیا۔ اگر یہ سرمایہ دار، جاگیر دار اور نوکر شاہی اس قدر ننگا استحصال اور لوٹ نہ مچاتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے سات کروڑ بھائی مغربی پاکستان کے پانچ کروڑ بھائیوں کو آخری سلام کہنے پر مجبور ہوتے۔

مغربی پاکستان اور خود بنگال کے عوام اچھی طرح سے واقف ہیں کہ ملک کی تباہی، خون خرابے، ملک کی تقسیم اور جنگ و جدل صرف اور صرف جاگیر داروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اب اگر ملک کی سالمیت کو پھر خطرہ ہے تو انہی کی وجہ سے! چھوٹی قومیت کے لوگ اپنی سرزمین پر، سہگل، آدم جی داؤد، ولیکا کے ان کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کو ظلم و استحصال کا نشان تصوّر کرتے ہیں۔ اسی لیے انہیں احساسِ محرومی اور مایوسی پیدا ہو رہی ہے۔ اگر فوری طور پر ان ظالم سرمایہ داروں سے یہ کارخانے، ملیں، فیکٹریاں اور بڑے زمینداروں سے زرعی زمینیں چھین کر مزدوروں اور کسانوں کے حوالے نہ کی گئیں تو ملک کی پسماندہ اور کم ترقی یافتہ قومیتوں کا احتجاج بجا بھی ہے اور بڑھتا بھی رہے گا جس کی وجہ سے ملک کی سالمیت، وحدت اور یکجہتی کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔

جہاں تک سرمایہ داروں کی ملک دوستی کا تعلق ہے، اس کا اندازہ تو سب کو ہی ہے۔ عوام کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے۔ لوگوں کو یاد ہے کہ بھٹو صاحب نے ملک کے سرمایہ داروں سے کہا تھا کہ وہ بیرونِ ملک جمع شدہ غیر ملکی زرِ مبادلہ کو واپس ملک میں لائیں۔ ملک کو اس رقم کی انتہائی ضرورت ہے۔ لیکن سرمایہ داروں کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔ پھر آخری وقفہ دیا گیا لیکن سرمایہ دار ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ وقفے تین دفعہ بڑھائے گئے لیکن پھر بھی سرمایہ داروں نے کوئی لفٹ نہ دی۔ اس پر وزیر خزانہ مبشّر نے پھانسی اور عمر قید کی سزائیں تجویز کیں لیکن آخر ہُوا کیا؟ زرِ مبادلہ ملک میں واپس نہ آیا۔ ملک کی ضرورت پوری نہ کی گئی، کیا یہی ملک دوستی اور وطن پرستی ہے؟ کون ان سرمایہ داروں کی وطن دوستی پر یقین کرتا ہے۔

ملک کے بہی خواہ صرف مزدور، کسان اور دوسرے محنت کش ہیں۔ ملک کی سالمیت، یک جہتی اور تحفظ کے خلاف سرمایہ دار، جاگیر دار اور نوکر شاہی سازشوں میں مصروف ہے اس لیے مزدور طبقہ پر ڈی پی آر کا اطلاق ناقابلِ برداشت ہے۔ ڈی پی آر کا اطلاق صرف اور صرف سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور ان کے حواریوں پر ہی ہونا چاہیئے۔

ہمیں ملک کی سالمیت اور یک جہتی اور اتحاد عزیز ہے اس لیے ہم عوامی جمہوریت کا پروگرام لے کر آگے بڑھ رہے ہیں جس میں زرعی زمینیں کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی، بڑی بڑی صنعتوں، کارخانوں ملوں اور فیکٹریوں کو عوامی قبضہ میں لے کر مزدور طبقہ کی نگرانی میں چلایا جائے گا، پھر یہ استحصالی نہ ہوں گے تو مختلف قومیتوں کے درمیان شک و شبہات کے جذبات ختم ہو جائیں گے اور تمام قومیتوں کے مزدور کسان مل جل کر اقتدار کریں گے۔

دانشوروں، طالب علموں اور درمیانے طبقے سے اپیل

اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ مزدور طبقہ نہ صرف اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہا ہے بلکہ اپنے ساتھ دوسرے محنت کشوں کی معاشی سیاسی اور سماجی آزادی کے لیے بھی جدوجہد کر رہا ہے۔ مزدور طبقہ انقلاب میں ہراوّل دستہ ہے لیکن وہ کسان طبقے اور دوسرے محنت کشوں کے انقلابی متحدہ محاذ کے بغیر نہ تو خود ہی آزاد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اپنے دوسرے حلیفوں کو آزاد کرا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ دانشوروں، طالب علموں اور درمیانے طبقے کا مستقبل مزدور کسان اتحاد اور جدوجہد سے ہی وابستہ ہے۔ ادیب شاعر، صحافی، وکیل، ڈاکٹر، ڈرائیور، طالب علم، استاد، پروفیسر، ریڑھی والے، خوانچے والے، چھوٹی موٹی تجارت

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں

بقیہ: مزدوروں پر فائرنگ

کرنے والے، کلرک، بابو، مختلف دفتروں میں دوسرے ملازمین، سب گو کہ اوپری طبقات کی جانب دیکھتے ہیں اور سرمایہ دار طبقے میں نہ سہی، تو ان کے حواریوں میں اپنے آپ کو شریک کرنے کے لیے خواہشمند ہوتے ہیں لیکن دنیا کے مختلف ملکوں کی تاریخ شاہد ہے کہ آج تک درمیانہ طبقہ سرمایہ دار طبقے کی جگہ نہ لے سکا لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی غیر مساوی ترقی نے اس کو مزدور طبقہ میں ضرور شامل کر دیا ہے۔

۷، ۸ رجون ۱۹۷۲ء کو منگھو پیر کے صنعتی علاقے میں مزدوروں پر فائرنگ کے بعد اس پورے علاقے میں زندگی کے تمام کاروبار بند رہے۔ مزدوروں نے بھوک کا شکار ہونا پسند کیا۔ لیکن حکومت سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے آگے سر جھکانے پر راضی نہ ہوئے۔ لیکن درمیانے طبقے کے لوگوں نے مزدوروں کے ساتھ عملی ہمدردی کا ثبوت نہ دیا۔ اور آج جبکہ لانڈھی کورنگی کے مزدور وحشیانہ مظالم کا شکار ہیں، بہت سے مزدور فائرنگ کے نتیجے میں شہید ہو گئے ہیں، زخمی ہیں، آپ کی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ شہر میں کوئی اثر ہی نہیں ہوا بلکہ الٹا پراپیگنڈہ مزدوروں کے خلاف کیا جا رہا ہے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جیسے ہی یہ اطلاع شہر پہنچتی تو تمام ڈرائیور، کنڈیکٹر بسیں، کاریں ٹیکسیاں اور رکشا چلانے بند کر دیتے، طالب علموں اور استادوں نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا ہوتا، تعزیتی جلسے کیے جاتے، ریڑھی لگانے والے دوستوں نے کاروبار بند کر دیا ہوتا دفتروں کے ملازم دفتر نہ گئے ہوتے، شاعروں نے نظمیں، مرثیہ لکھے ہوتے، افسانہ نگاروں نے افسانے اور ادیبوں نے مضامین لکھے ہوتے، صحافیوں نے ہڑتال کی ہوتی، اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی خبروں کا بائیکاٹ کیا ہوتا، ہر جسمانی و ذہنی محنت کرنے والے کے گھروں پر سیاہ جھنڈے لہرائے جاتے لیکن یہ سب کچھ تو درکنار، زبانی کلامی بھی ہمدردی نہ کی گئی۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی جدوجہد میں مزدور طبقہ آپ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ آپ کے آگے ہوگا، اس لیے کہ اس طبقہ کی قیادت میں سامراج دشمن، جاگیردار دشمن اور سرمایہ دار دشمن عوامی محاذ کی اگوائی مکمل ہوتی ہے

ترقی پسند ادیب، ترقی پسند حلقوں، ترقی پسند طالب علم تنظیموں، ترقی پسند سماجی تنظیموں کا مقصد کیا ہے؟ مستقبل مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کے ہاتھ میں ہے۔ آگے بڑھیے انہیں آپ کی ضرورت ہے اور آپ کو مستقبل کے لیے مزدوروں، کسانوں کی حمایت کی ضرورت ہے۔ ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ اپنا رشتہ سرمایہ داروں سے وابستہ کرنے کے خواب کو بھول جائیں اور مزدور کسان، دوسرے محنت کش اور دانشور اتحاد حقیقی، ٹھوس، منطقی اور تجرباتی فارمولے کو اپنائیں۔ یقیناً اگر ایک دفعہ یہ اتحاد پائیدار بنیادوں پر قائم ہو گیا تو یہ پاکستان ہمارا ہے اور آپ کا بھی! آپ بھی روز روز کی پریشانیوں سے نجات حاصل کر لیں گے اور ہم بھی! پھر یہ گدھ جو ہماری قومی معیشت پر ڈاکے ڈالتے ہیں، اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

"ہشت نگر سے کراچی تک"

ہشت نگر سے کراچی تک ہر جگہ مزدوروں، کسانوں پر تشدد ہو رہا ہے، استحصال ہو رہا ہے، کوہ نور ریان ملز کے مزدوروں پر پولیس کا تشدد اور مزدور رہنماؤں کی گرفتاری، ملتان کھاد فیکٹری کے مزدوروں پر پولیس کا وحشیانہ تشدد، گھارو میں پولیس کا راج اور اب کراچی میں مزدوروں پر پولیس فائرنگ۔ اس کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے دیہاتوں میں کسانوں پر ظلم و زیادتی وڈیروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے کارنامے ہیں

تمام سرمایہ دار، جاگیردار اور سیاسی پارٹیاں، مزدوروں کسانوں کے خلاف متحد ہو چکی ہیں۔ محنت کشوں کو اپنے جھنڈے تلے منظم ہونا ہوگا اور ان تمام سرمایہ دار پارٹیوں کا بائیکاٹ کرنا ہوگا۔ یہ تمام سیاسی جماعتیں پورے ملک میں مزدور کسانوں کی دشمن ہیں۔

بقیہ: میرٹھ سازش کیس

وہ کمیونسٹ ہیں۔ اور مرتے دم تک کمیونسٹ رہیں گے، ان کی زندگی کا مقصد کمیونسٹ انقلاب ہے، برطانوی سامراج کے اقتدار کا تختہ الٹ کر ہندوستان میں مزدور کسان راج قائم کرنا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا ہے جو سامراج، سرمایہ داری اور جاگیرداری کی لعنت سے پاک ہو۔ استحصال لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد کا نام تک مٹا دیا جائے۔ اسپراٹ نے اپنے بیان میں کہا کہ "مجسٹریٹ نے ایک جگہ میری تقریر کے اس حصے کا حوالہ دیا ہے، جس میں میں نے کہا تھا کہ تشدد ہماری پالیسی کا ایک حصہ ہے۔ میں اپنے بیان کے اس حصے سے انحراف نہیں کروں گا، بلکہ زور دار الفاظ میں کہوں گا کہ ہم تشدد کو استعمال کریں گے"۔

عدالت کے مصنف مسٹر یارک نے، ۲۷ افراد پر شاہ برطانیہ کے خلاف سازش کرنے کا الزام عائد کیا۔ انھوں نے سات سو صفحات میں اپنا تحریری فیصلہ قلمبند کیا۔ ان کا فیصلہ اس بات کی روشنی میں تھا کہ ان میں سے بے شمار لوگوں نے طاقت کے ذریعہ موجودہ نظام کو ختم کرنے کے لئے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ چنانچہ مظفر احمد کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ جبکہ دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں کو بارہ، دس، سات اور پانچ سال تک کی قید سخت کی سزا دی گئی۔

مسٹر یارک کے اس فیصلے کے خلاف پورے ہندوستان اور برطانیہ میں احتجاج ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ برطانوی حکومت کو پوری دنیا کی لعنت و ملامت کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کو جھوٹے مقدمے میں پھانس کر انہیں اذیت ناک سزاؤں کا حکم سنا دیا تھا۔ بھارت اور برطانیہ میں اس عدالتی فیصلے کے خلاف قراردادیں منظور کی گئیں اور احتجاج کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ احتجاج کرنے والوں میں نیویارک کے ارک لبشپ، ایچ جی ویلز، پروفیسر البرٹ آئن اسٹائن، رومین رولینڈ اور پروفیسر ہیرالڈ لاسکی شامل تھے۔

چنانچہ اس فیصلے کے خلاف کمیونسٹ رہنماؤں نے الہ آباد ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی جو سماعت کے لئے منظور کر لی گئی۔ اس وقت ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شاہ سلیمان تھے جو مسٹر یارک سے کہیں زیادہ روشن خیال، اور انتہائی شریف المزاج تھے۔

دلائل کا آغاز ۲۴ رجولائی ۱۹۳۳ء کو ہوا۔ اور آٹھ دنوں میں یعنی ۳ راگست کو مکمل ہو گیا۔ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں کمیونسٹوں کے چوتھے گروپ کے سات افراد کو رہا کر دیا۔ دیگر تین گروپ کے ممبروں کی سزائے قید کی مدت کم کر کے زیادہ سے زیادہ تین سال کر دی گئی۔ اسطرح مظفر احمد کی عمر قید کی سزا تین سال ہو گئی۔

حکومت کو اس مقدمے پر تقریباً بیس لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے۔ حکومت نے جس مقصد کے لئے کمیونسٹوں پر مقدمہ قائم کیا تھا وہ مقصد بھی پورا نہیں ہوا الٹا پورے ہندوستان میں کمیونسٹوں سے زبردست ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ کمیونسٹ نظریات اور خیالات جنگل کی آگ کی طرح ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گئے۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کا پروگرام زیادہ مقبول ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کے "مکمل آزادی" کے نعرے کو ۱۹۲۹ء میں لاہور میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کو اپنانا پڑا۔ اس طرح ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی برصغیر کی آزادی علمبردار بن گئی۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi

2-9. NOV. 1972

